ہمارا علم و ادب

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان

المصطفیٰ علمی مرکز
۳۶۰ اولڈ کیمپس
گاڑی کھاتہ حیدرآباد

نورِ چشم فلائیٹ لیفٹیننٹ عبدالحسیب (مرحوم)

اور

عزیزِ گرامی پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری (مرحوم)

کی یاد میں

ع افسانہ کہتے کہتے افسانہ بن گئے تم

غلام مصطفیٰ خان

ہمارا علم و ادب

از

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان
ایم۔اے۔ ایل ایل بی۔ پی ایچ ڈی۔ ڈی لٹ

شائع کردہ
المصطفیٰ علمی مرکز
۳۶۔ اولڈ کیمپس
گاڑی کھاتہ حیدرآباد

نام کتاب	ہمارا علم و ادب
مصنف	ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان
سال اشاعت	۱۴۰۵ھ / ۱۹۸۵ء
قیمت	۲۵ روپے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

یہ میرے ۶ مضامین کا مجموعہ ہے جو بعض عزیزوں کے اصرار پر شائع کیا جا رہا ہے۔ مضامین کیسے ہیں، یہ تو اہلِ علم حضرات جانیں۔ باقی میں نے ان کی اشاعت کو صرف اس لئے مناسب جانا کہ عمر کی اب آخری منزل ہے۔ اگر یہ محفوظ ہو جائیں تو ممکن ہے کہ کسی نہ کسی لحاظ سے طلبہ کیلئے کبھی مفید ثابت ہو سکیں۔

مضمون نمبر ۴ بہت عرصہ ہوا۔ رسالہ نقوش (لاہور) کے لیئے تیار کیا گیا تھا لیکن اس کی اشاعت میں بہت تاخیر ہوئی تو پھر ایک دوسرا مضمون "اردو میں قرآن و حدیث کے محاورات" کے نام سے تیار کیا گیا جو کتابی صورت میں ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد نے ۱۹۸۰ء میں شائع کر دیا ہے۔

عزیز گرامی ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب اور عزیزی ڈاکٹر فضلِ حق خورشید سلمہٗ کا بہت ممنون ہوں کہ انھوں نے پروف درست کیئے اور محترم محمد شریف صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے طباعت و اشاعت کا اہتمام فرمایا۔ حافظ صابر بن ذوقی سلمہٗ کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے بڑی توجہ سے کتابت فرمائی۔ اللہ پاک ان سب کو جزائے خیر دے۔ آمین۔

فقط

احقر غلام مصطفےٰ خاں

غلام مصطفےٰ خان

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برصغیر میں حق و باطل کے معرکے

ایک اجمالی جائزہ

حزب اللہ اور حزب الشیطان کی جنگ ازل سے ہے۔ شیطان کو خواہ مخواہ پیدا نہیں کیا گیا۔ ابو جہل اور ابو لہب بلا وجہ اسلام سے برسرپیکار نہیں تھے۔ نور و ظلمت، سفید و سیاہ، نیک و بد جیسی متناقض اور متضاد چیزیں اسی لیے ہیں کہ وہ انسان جس کے لیے پوری کائنات پیدا کی گئی ہے خیر و شر میں تمیز کر سکے، اپنی راہ سے گندگیوں کو ہٹا سکے اور خود کو صراط مستقیم پر چلا سکے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اشرف و اکمل بنایا گیا ہے اس لیے آپؐ کے سامنے عالمی معاشرے کی اصلاح کا مشن تھا اور یہی مشن آپؐ کے متبعین کے پیش نظر تھا جنھوں نے اس بسیط و عریض دنیا کے گوشے گوشے میں دین کی شمع کو روشن کیا اور انسانیت کو اُس کا صحیح مقام سمجھایا۔

باب الاسلام برصغیر پاک و ہند میں سندھ کو باب الاسلام کہا جاتا ہے۔ یہاں اور برصغیر کے دوسرے مقامات میں ۲۵ صحابۂ کرامؓ کی تشریف آوری تاریخ سے ثابت ہے[1] اور پہلی صدی ہجری میں ۳۶۔ دوسرے حضرات بھی تشریف لائے جنھوں نے

---

[1] محمد اسحٰق بھٹی۔ فقہائے ہند۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۱۱، ۱۳ (لاہور ۱۹۷۴ء)

اس خطۂ ارض کو دین کے انوار سے منوّر کیا۔ سب سے پہلے بمبئی کے قریب تھانہ بندرگاہ پر ۱۵ھ میں عربوں نے حملہ کیا اور ٹھٹھہ کے قریب دیبل[1] پر بھی اسی زمانے میں وہ حملہ آور ہوتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں سیستان فتح ہوگیا تھا لیکن یہاں کی بغاوتوں کو فرو کرنے کے لیے حضرت عثمان رضی عنہ کے زمانے میں حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضؓ صحابی نبرد آزما ہوئے اور اُن تمام علاقوں پر قابض ہو گئے جو آج کل مکران اور سیستان میں شامل ہیں[2] گویا خلفائے راشدینؓ کے عہدِ زرین ہی میں برصغیر کے مختلف علاقوں میں اسلام کا پرچم لہرانے لگا اور پھر مختلف ادوار میں یہاں کے لیے مسلمان سردار مقرر کیے جانے لگے۔

۸۶ھ میں دمشق کے تختِ شاہی پر ولید اموی متمکن ہوا اور اس کی طرف سے مذکورۂ بالا علاقوں کے لیے حجاج کو نگراں مقرر کیا گیا۔ اسی زمانے میں لنکا میں کچھ عرب تاجر فوت ہوئے تو وہاں کے راجہ نے ان کی عورتوں اور بچّوں کو ایک جہاز میں سوار کر کے عراق روانہ کیا۔ راستے میں دیبل کے قریب کچھ ڈاکوؤں نے ان پر حملہ کیا۔ حجاج کو معلوم ہوا تو اس نے راجہ داہر کو لکھا کہ ان سب کو میرے پاس بحفاظت بھیجدو۔ راجہ نے معذرت کی کہ ان ڈاکوؤں پر میرا بس نہیں ہے۔ لیکن اس نے اسی زمانے میں مکران کے کچھ باغی عربوں کو پناہ دی تھی اس لیے ان کی سرکوبی کے لیے حجاج نے اپنے نوعمر بھتیجے محمد بن قاسم کو روانہ کیا۔ انھوں نے ۹۳ھ میں سندھ پر

---

[1] مولانا سلیمان ندوی "عرب و ہند کے تعلقات" صفحہ ۱۴۳ (الہ آباد ۱۹۳۰ء)

[2] مولانا ابوظفر ندوی "تاریخ سندھ" صفحہ ۲۸، ۳۱ (اعظم گڑھ ۱۹۴۷ء)

حملہ کیا اور تین برس کے عرصے میں چھوٹے کشمیر (یعنی پنجاب) کی سرحد (ملتان) سے لے کر کچھ تک اور مالوہ کی سرحد پر قبضہ کر لیا۔ لیکن ۹۶ھ میں جب ولید کی جگہ سلیمان تخت نشین ہوا تو اس نے محض ذاتی عناد پر محمد بن قاسم کو واپس بلا لیا اور آخر قتل کرا دیا۔[1] بہر حال فتح سندھ دراصل فتح اسلام ہے۔ کیونکہ اسی زمانے سے اسلام باقاعدہ برصغیر میں داخل ہوا۔ لنکا جزائر مالدیپ، کھنبایت، چیمور (ضلع قلابہ)، مالابار، کورومنڈل معبر وغیرہ بہت سے علاقوں میں مسلمانوں کی آمد اور قیام کا زمانہ اسی عہد سے مذکور ہے۔ لیکن پھر قریب تین صدیوں تک تاریخ کی شمع بے نور نظر آتی ہے۔

غزنوی دور تیسری صدی ہجری کے آخر میں جب خلافت عباسیہ میں زوال آیا تو (ایشیائی) ترکستان میں سامانی خاندان کی ترک سلطنت قائم ہوئی جس کے ایک ترک غلام الپ تگین نے چوتھی صدی ہجری میں غزنین میں اپنی حکومت قائم کی۔ پھر جب سبکتگین نے ۳۶۶ھ ۹۷۶ء میں حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تو اس وقت کابل اور پشاور کا علاقہ پنجاب کے راجہ جے پال کے قبضے میں تھا۔ اس نے طغان اور غزنین کے درمیان ۳۶۹ھ، ۹۷۹ء میں سبکتگین پر حملہ کیا لیکن ہار گیا پھر اس نے شمالی ہندوستان کے تمام ہندو راجاؤں کو متحد کیا اور اس مرتبہ سبکتگین سے پشاور میں مقابلہ ہوا۔ لیکن یہ متحد فوجیں بری طرح تباہ ہوئیں اور پہلی بار ایک مسلمان امیر ۳۷۰ھ ۹۸۰ء میں پشاور میں متعین ہوا۔[2] اس کے بعد محمود کا

---

[1] محمد بن قاسم کے قتل کا سبب راجہ داہر کی دو بیٹیوں کا افسانہ محض بہتان ہے دیکھیں عرب و ہند کے تعلقات صفحہ ۱۶۔ [2] ہاشمی فرید آبادی۔ تاریخ مسلمانان پاکستان و ہند۔ حصہ اوّل۔ صفحہ ۱۱۲ (کراچی۔ سال طباعت درج نہیں)

زمانہ آتا ہے جس نے غزنین سے ہزاروں میل کا فاصلہ طے کرکے برصغیر پر متعدد حملے کیے لیکن جبر و تشدد سے ہمیشہ گریز کیا۔ الفنسٹن لکھتا ہے کہ :-

"اس میں شک نہیں کہ محمود نہایت دین دار اور سچا مسلمان تھا اور شاید کوئی بھی بڑی لڑائی ایسی نہ تھی جس میں سر بسجود ہوکر اس نے خدا سے فتح و نصرت کی دعا نہ مانگی ہو۔ لیکن ہم ایک مثال بھی نہیں سنتے کہ اس نے کسی ہندو کو جبراً مسلمان کیا ہو اور ایک شہادت بھی ایسی نہیں ملتی کہ جنگ یا قلعہ گیری کے موقع کے سوا کسی ہندو کو قتل کرایا ہو۔"[1]

یہی حال سومنات کی بت شکنی کے موقع پر ہوا اور محمود نے ہمیشہ ایک صحیح مسلمان کا کردار پیش کیا، حالانکہ اس سے پہلے معبر کے مسلمانوں[2] پر اور سبکتگین کے سفیروں[3] پر ہندوؤں کے ظلم و تشدد کے واقعات تاریخ میں محفوظ ہیں۔

راجاؤں کے فتنے کے علاوہ قرامطہ کا فتنہ بھی محمود کے ہاتھوں فرو ہوا۔ قرامطہ کا پہلا داعی سنہ ۲۷۰ھ میں سندھ آیا تھا جہاں اس نے اپنے مذہبی اور سیاسی خیالات کی ترویج کرکے اپنے فرقے کے قیام کی راہ ہموار کی۔ پھر قاہرہ کی فاطمی حکومت نے سنہ ۳۶۶ھ / سنہ ۹۷۶ء میں یکایک اپنی فوج بھیج کر ملتان پر قبضہ کرلیا۔ اس طرح فاطمی (قرمطی) حکومت یہاں بھی قائم ہوگئی۔ اور اسی کے ایک حاکم ابوالفتح داؤد نے محمود غزنوی کے خلاف راجہ جے پال

---

[1] بحوالہ ایضاً۔ جوامع الحکایات، تاریخ گزیدہ اور تاریخ فرشتہ وغیرہ میں محمود کی سخاوت، تقویٰ اور خدا ترسی کے بہت سے واقعات درج ہیں۔

[2] شیخ محمد اکرام: آبِ کوثر۔ صفحہ ۵۸ (لاہور ۱۹۵۸ء)

[3] ہاشمی فرید آبادی۔ صفحہ ۱۱۵

کی مدد کی۔ لیکن محمود نے ملتان پر قبضہ کر لیا تو قرامطہ وہاں سے بھاگ کر منصورہ آ گئے لیکن محمود نے یہاں سے بھی انھیں مار بھگایا اور ان کے عقائد کا انسداد کر دیا۔ محمود کے حملے سیاسی ہی سمجھے جائیں تب بھی باطل کا استیصال نتیجۃً ہوا ہے۔ پھر اسی زمانے سے اولیائے کرام[۱] کا ورود مسعود شروع ہوا۔ شیخ اسماعیل ۳۹۵ھ/۱۰۰۵ء میں لاہور تشریف لائے۔ شیخ صفی الدین گازرونی (م۔ ۳۹۸ھ/۱۰۰۷ء) اُچہ (بہاولپور) میں قیام پذیر ہوئے۔ شیخ فخر الدین زنجانی جو شیخ سعد الدین حموی کے پیر تھے لاہور میں تشریف فرما ہوئے۔ یہیں حضرت داتا گنج بخشؒ (م۔ ۴۶۹ھ/۱۰۷۶ء) تھے اور کچھ عرصے کے بعد سخی سرور (م۔ ۵۷۷ھ/۱۱۸۱ء) نے شاہ کوٹ (ڈیرہ غازی خان) میں اشاعت اسلام کا کام سر انجام دیا۔ پھر دوسرے صوفیاء بھی تشریف لائے۔

غوری دور

محمود غزنوی نے ہندوستان میں مستحکم قیام کا کوئی بندوبست نہیں کیا تھا۔ اس لیے اس کے جانے کے بعد یہاں کے راجاؤں نے پھر منظم ہونا شروع کر دیا اور جب معز الدین محمد غوری نے ۵۸۸ھ/۱۱۹۲ء میں پرتھوی راج سے دوسری مرتبہ ترائن (تراوڑی) میں جنگ کی تو مؤخر الذکر کے ساتھ ایک سو پچاس راجاؤں نے شرکت کی لیکن وہ سب بری طرح ہار گئے۔ اس طرح دہلی سے اجمیر تک مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی۔ پھر محمد غوری تو واپس غزنین چلا گیا۔ لیکن اس نے قطب الدین ایبک کو ہندوستان میں اپنا نائب مقرر کر دیا جس نے گجرات، گوالیار

---

[۱] ٹھٹھہ کے قریب گجو میں شیخ ابو تراب کا مزار ہے جو ۱۷۱ھ (مطابق ۷۸۸ء) میں فوت ہوئے۔ لیکن ڈاکٹر محمد شفیع نے مقالات ید سندھ (صفحہ ۹) میں لکھا ہے کہ ان کا سالِ وفات عیسوی والا صحیح ہے (یعنی وہ ۸۸ ۷ء میں نہیں بلکہ ۸۸ ۷ھ میں فوت ہوئے)

اور بیانہ وغیرہ کو بھی فتح کر کے حکومت میں توسیع کی۔

اسی زمانے میں کھوکھر قوم کا فتنہ بھی سر اٹھائے ہوئے تھا۔ یہ لوگ نیلاب (سندھ) اور سوالک کی پہاڑیوں کے درمیان رہتے تھے۔ مسلمانوں کو قتل کرنا ان کا شیوہ تھا۔ دختر کشی ان کے یہاں عام تھی اور بہت سی بیہودہ رسمیں بھی تھیں۔ ۵۸۶ھ میں کھوکھروں نے بغاوت کی تو محمد غوری نے ہندوستان آ کر ان کا قلع قمع کیا[1] لیکن جب وہ وطن واپس جا رہا تھا تو ایک اسماعیلی فدائی نے دریائے جہلم کے قریب شہید کر دیا۔ کیونکہ اس نے ان لوگوں کا ملتان اور ایران سے استیصال کیا تھا۔ پرتھوی راج ہی کے زمانے میں سلطان الہند خواجہ غریب نوازؒ کا ورود مسعود اجمیر میں ہوا۔ آپ وہاں کی جھیل کے کنارے قیام پذیر تھے۔ آپ کے کسی عقیدت مند کو راجہ نے ایذا پہنچائی تو آپ نے راجہ کے پاس سفارش بھیجی۔ اس نے بے اعتنائی برتی اور کہا کہ "یہ شخص یہاں آیا ہے اور بیٹھا غیب کی باتیں کرتا ہے۔" آپ نے سنا تو فرمایا "پھتورا را زندہ گرفتیم و داریم"۔ یہی وہ موقع تھا جب کہ پھتورا (پرتھوی راج) مارا گیا تھا[2]۔

سلطان الہندؒ

حضرت سلطان الہندؒ (م ۶۳۳ھ) کی بدولت سیکڑوں لوگ مسلمان ہوئے اور وہ ایک ایسی روشن شمع ہیں جس سے ایک عالم مستفیض ہے۔ آپ ہی کے سلسلے میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، بابا فرید شکر گنجؒ، احمد صابر کلیریؒ، نظام الدین اولیاءؒ، نصیر الدین چراغ دہلویؒ، امیر خسروؒ، گیسو درازؒ

---

[1] تاریخ فرشتہ۔ جلد اول۔ صفحہ ۵۹-۶۰۔ دیکھیں تاریخ پاشی۔ صفحہ ۱۵۵-۱۵۶۔ [2] حضرت خواجہ کے متعلق ڈاکٹر محمد شفیع کے مقالات حصہ اول۔ صفحہ ۲۴۸ مطبوعہ (لاہور ۱۹۶۹ء) دیکھیں۔

اور ہیانہ وغیرہ کو بھی فتح کر کے حکومت پیدا کی۔

اسی زمانہ میں ککھر قوم کا فتنہ بھی سر اٹھائے ہوئے تھا۔ یہ لوگ نیلاب (سندھ) اور سوالک کی پہاڑیوں کے درمیان رہتے تھے۔ مسلمانوں کو قتل کرنا ان کا شیوہ تھا۔ دختر کشی ان کے یہاں عام تھی اور بہت سی بیہودہ رسمیں بھی تھیں۔ ۱۲۰۶ء میں ککھروں نے بغاوت کی تو محمد غوری نے ہندوستان آکر ان کا قلع قمع کیا۔[1] لیکن جب وہ وطن واپس جا رہا تھا تو ایک اسماعیلی فدائی نے دریائے جہلم کے قریب شہید کر دیا۔ کیونکہ اس نے ان لوگوں کا ملتان اور ایران سے استیصال کیا تھا۔

پرتھوی راج ہی کے زمانے میں سلطان الہند خواجہ غریب نوازؒ کا ورود مسعود اجمیر میں ہوا۔ آپ وہاں کی جھیل کے کنارے قیام پذیر تھے۔ آپ کے کسی عقیدت مند کو راجہ نے ایذا پہنچائی تو آپ نے راجہ کے پاس سفارش بھیجی۔ اس نے بے اعتنائی برتی اور کہا کہ "یہ شخص یہاں آیا ہے اور بیٹھا غیب کی باتیں کرتا ہے"۔ آپ نے سنا تو فرمایا "پتھورا را زندہ گرفتیم و دادیم" یہی وہ موقع تھا جب کہ پتھورا (پرتھوی راج) مارا گیا تھا۔[2]

سلطان الہندؒ

حضرت سلطان الہندؒ (م۔ ۶۳۳ھ) کی بدولت سیکڑوں لوگ مسلمان ہوئے اور وہ ایک ایسی روشن شمع ہیں جس سے ایک عالم مستفیض ہے۔ آپ ہی کے سلسلے میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، بابا فرید شکر گنجؒ، احمد صابر کلیریؒ، نظام الدین اولیاءؒ، نصیر الدین چراغ دہلویؒ، امیر خسروؒ، گیسو درازؒ

۱؎ تاریخ فرشتہ۔ جلد اول۔ صفحہ ۵۹۔ ۶۰۔ دیکھیں تاریخ ہاشمی۔ صفحہ ۱۵۵، ۱۵۶۔

۲؎ حضرت خواجہ کے متعلق ڈاکٹر محمد شفیع کے مقالات حصہ اول۔ صفحہ ۲۴۸ ۲ جلد (لاہور ۱۹۶۷ء) دیکھیں۔

وغیرہ کیسے اکابر ہیں جنھوں نے بلامبالغہ ہزاروں بلکہ لاکھوں کو مستفید فرمایا ہے۔ صاحب معارج الولایت نے خوب لکھا ہے کہ "ہر مسلمان پر جو ہندوستان (برصغیر) میں پیدا ہوا حضرت خواجہ صاحب کو حق اسلام پہنچتا ہے اس لیے کہ خواجہ صاحب کے ہندوستان تشریف لانے سے اسلام کو اور مسلمانوں کو تمکّن نصیب ہوا ہے"۔[1]

التتمش پھر قطب الدین ایبک (م۔ ۶۰۷ھ، ۱۲۱۰ء) کے بعد التتمش، ایک بیدار مغز اور خدا ترس بادشاہ ہوا اور اسی نے منگولوں (مغول) کے فتنے سے ہندوستان کو بچایا۔ ۶۳۳ھ ۱۲۳۶ء میں اس کے انتقال پر اس کی بیٹی رضیہ تخت نشین ہوئی۔ اس کے زمانے میں قرامطہ نے دہلی پر یورش کی لیکن انھیں بری طرح شکست ہوئی۔

بلبن دس سال حکومت کرنے کے بعد رضیہ کی جگہ ایک درویش صفت بادشاہ یعنی ناصر الدین محمود تخت نشین ہوا جس کا وزیر غیاث الدین بلبن ہی حکومت چلاتا تھا اور وہی ناصر الدین محمود کے انتقال (۶۶۴ھ، ۱۲۶۶ء) پر بغیر کسی مزاحمت کے بادشاہ ہوا۔ اور اس نے سب سے پہلے میواتیوں کے فتنے کو ختم کیا۔ کیونکہ ان لوگوں کی وجہ سے بری طرح بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ پھر اس نے فتنۂ مغول کو روکنے کے لیے بڑے سلیقے سے کام لیا۔ وہ لوگ چاہتے تھے کہ چناب کے پار، حکومت دہلی کا کوئی بڑا جنگی مرکز قائم نہ ہونے پائے اسی لیے وہ بار بار حملے بھی کرتے تھے اور کھوکھروں کو اسی مقصد کے لیے اپنا دوست بنالیا تھا۔ بلبن نے ان غارت گروں کی اس طرح سرکوبی کی کہ وہ لوگ پھر ہندوستان کی طرف رخ نہ کرسکے۔

---

[1] بحوالہ ایضاً

اس کی شان و شوکت کے متعلق برنی (۲۰) لکھتا ہے کہ :

"..... زابل و سیستان کے دیو پیکر جوانوں کو بڑی بڑی تنخواہیں دیکر نوکر رکھا تھا کہ ننگی تلواریں لیے ہوتے بادشاہ کی خواصی میں کمربستہ رہیں۔ سواری کے چلتے وقت قدم قدم پر صدائے بسم اللہ اس زور سے بلند ہوتی کہ بازار یا جنگل گونج اٹھتے۔ تماشائی اور سامعین کے بدن میں لرزہ پیدا ہو جاتا بلکہ بعض اوقات سُفَراء اور رُؤسا بھی بار یاب ہوتے وقت خوف سے گر پڑتے یا بے ہوش ہو جاتے تھے۔"

لیکن "صدائے بسم اللہ" کے علاوہ اس تقریب میں عجمی اور ایرانی اکابرہ کی تقلید کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ پھر بھی اللہ کا کرم ہوا کہ اسی دور میں بہت سے اہل اللہ مثلاً خواجہ بختیار کاکیؒ (م۔ ۶۳۲ھ، ۱۲۳۵ء)، بابا فرید شکر گنجؒ (م۔ ۶۶۴ھ، ۱۲۶۵ء) اور حضرت نظام الدین اولیاء (م۔ ۷۲۵ھ، ۱۳۲۵ء) کی بدولت دین کی تعلیم و تعلم کا چرچا رہا اور حال و قال کی محفلیں بھی رہیں لیکن ان میں مزامیر سے واسطہ نہیں تھا۔ حسن صغانی بدایونی (م۔ ۶۵۰ھ، ۱۲۵۲ء) اور قاضی رکن الدین جیسے علماء بھی دین کی خدمت کر رہے تھے[1]

خلجی تاہم دولت اور حکومت کی وجہ سے عقل اندھی بھی ہو جاتی ہے اس لیے علاؤ الدین خلجی (م ۷۱۶ھ، ۱۳۱۶ء) کے زمانے کا یہ واقعہ کس قدر افسوسناک ہے کہ اس عہد میں مصر کے ایک عالم شمس الدین ترک اپنے ساتھ حدیث اور متعلقات کی کوئی چار سو کتابیں لے کر ہندوستان آئے اور ان کا ارادہ تھا کہ ایک جامع شرح لکھ کر بادشاہ کو پیش کریں۔ لیکن وہ ابھی ملتان

---

[1] امیر حسن دہلوی کی فوائد الفواد اور امیر خسرو کی افضل الفوائد میں ایسے واقعات درج ہیں کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے سماع میں مزامیر سے نفرت کا اظہار فرمایا۔

ہی پہنچے تھے کہ انھیں معلوم ہوا کہ بادشاہ نماز پنجگانہ بھی نہیں پڑھتا بلکہ نماز جمعہ بھی ادا نہیں کرتا۔ اس لیے وہ رنجیدہ ہو کر وہیں سے واپس ہو گئے۔[1]

محمد تغلق

لیکن اس کے بعد جب محمد تغلق (۷۲۵ھ، ۷۵۲ھ) کا زمانہ آتا ہے تو ابن بطوطہ (م۔ ۷۷۹ھ) لکھتا ہے کہ "دین کے شعائر اس کے یہاں محفوظ ہیں اور نماز کے معاملہ میں وہ سخت گیر ہے۔ تارکین کے لیے سزائیں مقرر ہیں"[2] "اُس نے تمام غیر شرعی محصول منسوخ کر دیے۔ صرف زکوٰۃ اور عشر کی وصولی برقرار رکھی"۔

محمد تغلق کے بعد اُس کے جانشین فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ھ، ۷۹۰ھ) کے زمانے میں بھی دین کا بہت سا کام ہوا۔ فتوحاتِ فیروز شاہ (جس کا ترجمہ الیٹ کی جلد سوم میں ہے) اس عہد کے واقعات کی حامل ہے کہ زندیقوں کا ایک گروہ مستقل طور پر زندقہ اور الحاد کی ترغیب دیا کرتا تھا۔ شراب کا دور اُن کے یہاں عام تھا۔ جس میں ماں، بیٹی، بیوی کی تمیز نہیں تھی۔ ایک شخص گجرات میں خود کو باقی اور غیر فانی کہا کرتا تھا۔ انا الحق کا دعویٰ کرتا تھا۔ عورتیں مقبروں کی زیارت کو جاتی تھیں، امامیہ فرقہ تبرّا کرتا تھا، ایک احمد بہاری الوہیت کا دعویٰ کرتا تھا۔ ایک رکن الدین، مہدویت کا داعی تھا۔ بادشاہ نے ان تمام مفاسد کا قلع قمع کیا۔ ناجائز محصول ختم کیے۔ مالِ غنیمت صرف ایک خمس حکومت کے لیے اور باقی چار خمس سپاہیوں کے لیے مقرر کیا۔ شعائر اسلام کی ترویج میں حصہ لیا

---

[1] مولانا سلیمان ندوی کا مقالہ "ہندوستان میں علم حدیث" تفصیل کے لیے دیکھیں۔

[2] ابن بطوطہ (جلد ۲۔ صفحہ ۲۸۶) مطبوعہ پیرس۔

اور رفاہِ عام کے کاموں میں بہت کچھ پیش قدمی کی لے

سکندر لودھی پھر سکندر لودھی (۸۹۴ھ۔ ۹۲۳ھ) کے زمانے میں اسلام کے لیے جوش سے زیادہ اور ہوش سے کم کام لیا گیا۔ اگر الفنسٹن کی روایت صحیح ہے تو اس نے "مندر گرائے، لوگوں کو تیرتھ سے باز رکھنے کی کوشش کی، بعض دریاؤں میں اشنان کرنے سے منع کیا (وغیرہ)"۔ الیٹ (جلد۴) نے "تاریخ داؤدی کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ" اس نے نومسلموں کو مختلف مقامات پر زمینیں دیں۔ (لیکن) سالار مسعود کے نیزہ کا سالانہ جلوس بند کر دیا۔ اور عورتوں کو قبروں پر جانے سے روک دیا۔۔۔"

تیمور ان سے بہت پہلے تیمور (م۔ ۸۰۷ھ، ۱۴۰۵ء) کی تبلیغ کا انداز بھی جوش والا تھا۔ الیٹ (جلد۳) نے ملفوظاتِ تیموری میں سے تیمور کے "جہاد" کا مقصد اس طرح نقل کیا ہے:-

"ہندوستان آنے اور تمام مشقتوں کے برداشت کرنے سے میرے دو مقصد خاص ہیں۔ سب سے پہلے، اسلام کے دشمنوں (بُت پرستوں) سے جنگ کرنا۔ دوسرا مقصد دنیوی ہے کہ بت پرستوں کے مال و دولت کو لوٹنا تاکہ اسلام کی سپاہ کچھ حاصل کر سکے"۔

نواب حبیب الرحمٰن شیروانی مرحوم لکھتے ہیں کہ:۔

"امیر تیمور نے دریائے والگا سے گنگا کے کنارے

لے بلبن، محمد تغلق، فیروز شاہ تغلق اور سکندر لودھی سے متعلق مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے مضمون رسالہ "الفرقان بریلی (شاہ ولی اللہ نمبر ۱۹۴۱ء) سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

تک فتح کر کے کوئی صاحب داعیہ حاکم ان ملکوں میں نہیں چھوڑا تھا اور قریباً اس تمام ملک پر وہ خود فرمان فرما تھا جس سلطنت کی بنا محض قہر اور تسلط پر ہو اس کی پائیداری معلوم۔ امیر تیمور کے مرتے ہی اس عظیم الشان سلطنت کے تمام اجزا پریشان ہو گئے اور اس کے وارث چھوٹے چھوٹے ملکوں پر قابض ہو بیٹھے۔ اس زمانے کی اسلامی سوسائٹی کا اثر اس واقعے سے خوب معلوم ہو سکتا ہے کہ امیر تیمور جیسے جابر اور تند خو بادشاہ کی اولاد میں شاہ رُخ مرزا اور اُلغ بیگ مرزا جیسے نیک دل، کریم النفس اور عالم بادشاہ ہوئے"۔[۱]

بابر امیر تیمور کی اولاد میں بابر ۶ رمحرم ۸۸۸ھ (۱۴ر فروری ۱۴۸۳ء) کو پیدا ہوا تھا اور ۵ رجمادی الاول ۹۳۷ھ (۲۵ ر دسمبر ۱۵۳۰ء) کو فوت ہوا۔ سلطنت مغلیہ کا بانی ہوا۔ تاریخ میں ہے کہ اُس نے رانا سانگا اور ہندوستان کے دوسرے سربراہوں کی مجموعی فوج سے ۹۳۳ھ میں مقابلہ کیا تو اس وقت اس نے شراب ترک کر دی۔ بچپن میں خواجہ عبید اللہ احرارؒ (م۔ ۸۹۵ھ) کے مُرید قاضی عبد اللہ (المعروف خواجہ مولانا) کے زیرِ تربیت رہ چکا تھا

---

[۱] تذکرۂ بابر۔ صفحہ ۴ (علی گڑھ ۱۹۲۷ء)۔ راقم الحروف نے حیدرآباد سے ۱۹۶۱ء میں امیر کلالؒ کی ایک نادر قلمی سوانح عمری شائع کی تھی جو ان کے صاحبزادے امیر حمزہ کے نواسے شہاب الدین نے لکھی تھی۔ اس کے صفحہ ۲۸ تا ۳۲ میں امیر تیمور کی ان عقیدتوں کا ذکر ہے جو اسے حضرت بہاء الدین نقشبند بخاریؒ (م۔ ۷۹۱ھ) کے پیر امیر کلالؒ (م۔ ۷۷۲ھ) سے تھی اور جنھوں نے اس کی کامیابیوں کے لیے دعا فرمائی تھی۔

اس لیے اس کا تعلق بہرحال دین سے تھا اور اس کا بیٹا ہمایوں رح (۹۶۳ھ / ۱۵۵۶ء) بعض اثرات کے باوجود، عبادت گزار تھا۔

اکبر

پھر اکبر تخت نشین ہوا وہ بالکل ان پڑھ تھا۔ علمائے سوء نے اسے غلط راستے پر ڈال دیا۔ پھر ہندو رانیوں کے رشتے نے اُسے ہندو دین اور ہندو تہذیب سے قریب تر کر دیا۔ اسی لیے اس نے شیخ سلیم چشتی رح کا مقبرہ اور فتح پور سیکری کی مسجد بھی "ہندوانہ" طرز کی بنوائی۔ ملّا مبارک ناگوری (پدرِ فیضی و ابوالفضل) نے ۹۸۷ھ ایک محضر نامہ تیار کیا جس کا مضمون یہ تھا کہ "بادشاہ ظل اللہ ہے امام عادل ہے۔ مجتہد العصر ہے اور کسی کا پابند نہیں"۔ ملّا عبدالقادر بدایونی نے اس زمانے کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں لیکن اب بعض لوگ اکبر کے خاص مُشیروں یعنی فیضی اور ابوالفضل کی حمایت میں بدایونی کی ہر بات کی تردید کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن حضرت مجدد الف ثانی رح رم۔ ۱۰۳۴ھ) نے اس دور کے کئی فتنوں کے خلاف نبرد آزمائی کی۔ خلفائے ثلاثہ رض اور حضرت عائشہ رض سے اللہ کی رضا مندی اور ان کے مقاماتِ عالیہ کا ذکر قرآن پاک میں کئی جگہ آتا ہے لیکن لوگوں نے اللہ کے فرمان کو پس پشت ڈال کر ان بزرگوں کی شان میں نہ صرف گستاخی کی بلکہ سبّ و شتم کو اپنا دین [1] بنا لیا۔ حضرت مجدد رح نے ان کے خلاف بھی لکھا اور ابوالفضل نے جو نبوّت کے منافی اثرات اکبر پر ڈالے تھے اس کے خلاف عربی میں رسالہ اثبات النبوہ لکھا۔ اس کے شروع ہی میں آپ فرماتے ہیں :۔

"(ترجمہ) جب میں نے اس زمانے میں لوگوں کے اعتقاد میں اصل نبوّت کے متعلق فتور دیکھا۔ پھر ایک شخص معیّن (یعنی اکبر) کے یہاں نبوّت کے

[1] در مذہبے کہ دشنام طاعت باشد
مذہب معلوم و اہل مذہب معلوم

ثبوت اور تحقیق میں (زور) اور نبوّت کے شروع کردہ امور میں رفتور دیکھا) اور لوگوں میں اس کا شائع ہونا متحقق ہو گیا۔ یہاں تک کہ شرائع کی پیروی اور رسولوں پر یقین کی پختگی کی وجہ سے ہمارے زمانے کے بعض جابروں نے بہت سے علماء کو مختلف سختیاں اور ایذائیں پہنچائیں جن کا ذکر مناسب نہیں۔ بہت سے علمائے اسلام قتل کر دیے گئے۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اُس مجلس میں خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نام کی تصریح ترک کر دی گئی اور جس کا یہ اسم شریف تھا اسے بدل کر دوسرا نام رکھا گیا۔ گائے کا ذبح کرنا ممنوع قرار دیا گیا، حالانکہ یہ ہندوستان میں بڑے شعائر اسلام میں سے ہے۔ مساجد اور مسلمانوں کے مقابر ویران کر دیے گئے۔ کفّار کی عبادت گاہوں اور ان کے رسوم و عبادات کے دنوں کی تعظیم کی گئی۔ مختصر یہ کہ اسلام کے شعائر اور اس کی علامتیں باطل قرار دی گئیں اور کفّار کے رسوم اور ان کے ادیانِ باطلہ رائج کئے گئے حتیٰ کہ کفارِ ہند کے احکام ظاہر کیے گئے اور انھیں ان کی زبان سے فارسی میں منتقل کیا گیا تاکہ اسلام کے سارے آثار مٹا دیں۔

میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ شک اور انکار کا دائرہ پھیلتا جا رہا ہے۔ خود اطباء (یعنی علماء) بیمار ہو چلے ہیں اور اللہ کی مخلوق ہلاکت تک پہنچ گئی ہے۔ میں نے ایک ایک کے عقائد کو ٹٹولا اور اُن سے اُن کے شبہات دریافت کیے اُن کے دلی خیالات اور اعتقادات کی جانچ پڑتال کی تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس ساری خرابی کی وجہ یہ ہے کہ یہ زمانہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے دُور جا پڑا ہے اور حکمائے ہند اور فلسفہ کی کتابوں سے شغف بڑھ گیا ہے [illegible] ایسے افراد سے مناظرہ بھی کیا جنھوں

نے فلسفہ اور کافروں کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور جس کو فضل اور فضیلت کا دعویٰ بھی ہے (ابوالفضل کی طرف اشارہ ہے)۔ ان لوگوں نے خلق خدا کو گمراہ کیا ہے اور تحقیق اصل نبوت اور شخص معین (نبی) کے لیے اس کے ثبوت کے سلسلے میں خود بھی بھٹکے ہیں اور دوسروں کو بھی بھٹکایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ حکمت و مصلحت اور مخلوق کی ظاہری حالت کو سنوارنا اور ان کو لڑائی جھگڑے اور خواہشات نفسانیہ کے تہلکے سے روکنا ہی حاصل نبوت ہے۔" حضرت مجددؒ سے فیضی[1] اور ابوالفضل کے واقعات کیا ہوتے ان کے بیان کی یہاں ضرورت نہیں۔ لیکن اثبات النبوۃ کے مذکورہ اقتباسات سے اکبری عہد کے تمام فتنوں کا اجمال معلوم ہوجاتا ہے اور بدایونی کے بیانات میں موشگافی کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی[2]

---

[1] شیخ عبدالحق ؒ نے فیضی کے متعلق لکھا ہے (ترجمہ): "فیضی اگرچہ فصاحت و بلاغت، زبان دانی اور انشاء پردازی میں یگانۂ روزگار تھا۔ لیکن وائے بدبختی کہ اس نے اپنے کو کفر و ضلالات کے گڑھے میں ڈال کر اپنی پیشانی پر رسوائی کا ایسا داغ لگایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امتیوں کے لیے اس کا اور اس کی منحوس جماعت کا نام لینا بھی درست نہیں"۔ از مولانا ابوالحسن زید فاروقی "حضرت مجددؒ اور ان کے ناقدین" صفحہ ۹۳۔ دہلی (۱۹۷۷ء)۔

[2] شیخ محمد اکرام مرحوم نے رودِ کوثر میں حضرت مجددؒ پر بہت سے اعتراضات کیے ہیں بلکہ ان کو کذب و افترا کا مرتکب بھی گردانا ہے۔ راقم الحروف نے ان کا نام لیے بغیر ایک رسالہ "حضرت مجدد الف ثانیؒ" ۱۹۶۵ء میں شائع کیا تھا۔ اور شائع کرنے سے پہلے مرحوم کو وہ مسودہ بھیجا تھا۔ لیکن انھوں نے کوئی رائے نہیں دی۔ البتہ بعد کے ایڈیشن میں کہیں

کہیں ترمیم کر دی۔ اور کہیں میری تردید کرنے کی کوشش بھی کی اور چونکہ ان کو حضرت مجددؒ سے کد تھی اس لیے بعد کی تحریروں کو بغیر ترمیم کے رہنے دیا۔

میرے رسالۂ مذکورہ کی اشاعت کے دس سال بعد ایک صاحب نے رسالہ مہر نیم روز (کراچی ۱۹۷۵ء) میں میری چند باتوں کی تردید کی ہے میں نے غلطی سے لکھدیا تھا کہ اکبرنامہ میں ابوالفضل نے نعت لکھی تھی۔ بعد میں غور کرنے سے معلوم ہوا کہ وہ دیباچہ تو مرتب اور مصحح کا ہے جس میں نعتیہ الفاظ ہیں میرے معترض نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابوالفضل نے عیارِ دانش میں نعتیہ کلمات اس لیے نہیں لکھے کہ وہ انوارِ سہیلی کا ملخص ہے۔ یعنی وہ یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ انوارِ سہیلی میں بھی نعت نہیں تھی۔ حالانکہ یہ بات غلط ہے۔ اُس میں نعتیہ کلمات موجود ہیں۔ راقم الحروف نے یہ بھی لکھا تھا کہ فیضی کی مثنوی مرکز ادوار جو علی گڑھ میں موجود ہے۔ نعت سے خالی ہے۔ معترض فرماتے ہیں کہ اگر وہ قریب العہد ہے تو بیشک ایسی بات درخورِ اعتنا ہے۔ ورنہ مشکوک ہے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ منظم طور پر فیضی کی تصانیف سے نعت خارج کی گئی ہے لیکن ٹھیک یہی بات ان کے اس قول کے خلاف کہی جاسکتی ہے کہ منظم طور پر فیضی کے دیوان میں کسی نے نعتیہ اشعار شامل کر دیے ہیں۔ اور یہ بات اس لیے صحیح ہو گی کہ ہم حضرت مجددؒ کے رسالۂ اثبات النبوہ کے مذکورۂ بالا اقتباس میں نعت سے متعلق تصریح دیکھ چکے ہیں۔

معترض نے میری فارسی دانی پر بھی اعتراض کیا ہے تو اس نادانی کا ہمیشہ سے مجھے اعتراف ہے۔ یہاں ایک بات اور عرض کر دی جائے کہ ڈاکٹر ظہورالدین نے اپنی کتاب ابوالفضل (صفحہ ۸۲) میں ابوالفضل کے ایک رقعہ کا حوالہ دیا ہے جو ۱۰۰۴ھ میں لکھا گیا تھا اور جس میں

اس نے اپنے مکتوب الیہ کو دعا دی ہے کہ اُسے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی حاصل ہو۔ خدا کرے یہ دعا ابو الفضل ہی کے قلم سے ہو اور اس کے دل سے نکلی ہو۔ ابو الفضل نے آئین اکبری (ایشیاٹک سوسائٹی بنگال۔ کلکتہ ۱۸۷۲ء ج ۱) میں صفحہ ۲۳۵ سے شعراء کا حال شروع کیا ہے۔ سب سے پہلے فیضی کا ذکر ہے۔ اُس کی نل دمن اور سواطع الالہام کا ذکر ہے۔ قصائد اور غزلیات کے نمونے ہیں۔ پھر رباعیات ہیں جن میں زیادہ تر اکبر کی مدح ہے۔ ایک رُباعی یہ ہے:-

شاہا بشبم چراغ امید بخش   قندیلِ مرا فروغ جاوید بخش
زاں نور کزو چشم دلت روشن شد   یک ذرّہ مرا بنورِ خورشید بخش

ایک اور رباعی ملاحظہ ہو:-

خواہی کہ چو من راہ ہدیٰ بشناسی   نشناختہ شاہ را کجا بشناسی
این سجدۂ ناقبول سودت نہ دہد   اکبر بشناس تا خدا بشناسی

جہانگیر بدر الدین سرہندی کی کتاب مجمع الاولیاء [1] (قلمی) میں (جو بعد میں علی اکبر حسینی سے منسوب ہوگئی) اس عقیدت کی تفصیل ہے جو حضرت مجددؒ سے جہانگیر کو پیدا ہوگئی تھی۔ یہ بھی لکھا ہے کہ فتح کانگڑہ (نگر کوٹ) کی خوشی منانے کے لیے جہانگیر اپنے ساتھ حضرت مجدد کو لے گیا تھا اور وہاں گائے ذبح کی تھی، بت کو توڑا تھا اور مسجد کی تعمیر کی تھی اور اسلام کی ترویج پر زور دیا تھا۔

حضرت مجددؒ نے اپنے مکتوبات میں ارکان اسلام کی تبلیغ بھی کی اور معاشرتی اور سماجی اصلاحات [2] کے لیے بھی کوشش کی۔ بدعات کی بیخ کنی اور غلط (بالخصوص ہندوانہ) رسم و رواج کا استیصال آپ کے مکتوبات کا خاص مقصد تھا۔ پھر آپ کے صاحبزادے خواجہ محمد معصومؒ (م۔ ۱۰۷۹ھ) اور پوتے خواجہ سیف الدینؒ (م۔ ۱۰۹۶ھ)، دوسرے پوتے خواجہ عبد الاحد وحدت (م۔ ۱۱۲۶ھ) اور تیسرے پوتے محمد نقشبندِ ثانی (م۔ ۱۱۱۵ھ)

اورنگ زیب کے متعدد مکتوبات [3] اورنگ زیبؒ اور اس کے ارکانِ سلطنت کے نام ہیں۔ جن سے نہ صرف یہ کہ بادشاہ کی عقیدت کا ثبوت ملتا ہے بلکہ اس کے سیاسی

---

[1] مخطوطہ نمبر ۶۴۵۔ انڈیا آفس لندن

[2] ڈاکٹر سراج احمد خان نے "مکتوباتِ امام ربانی کی اہمیت" میں باب ششم انہی اصلاحات پر لکھا ہے۔ [3] ان تمام بزرگوں کے مکتوبات کی اشاعت کی سعادت راقم الحروف کو حاصل ہوتی ہے۔

محمد ہاشم کشمی کی زبدۃ المقامات (فصل ۸) سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہزادہ خرم (شاہجہاں) کے لیے حضرت مجددؒ نے بشارت دی تھی۔ پھر کشمی نے اس کے جلوس کی تاریخ "زینتِ شرع" لکھی۔

معاملات میں ان بزرگوں کی رہبری ظاہر ہوتی ہے اسی لیے نعمت خانِ عالی نے جل کر کہا تھا:-

افتراو زور و بہتان فال و خوابِ نحو احکاں   شید و خدعہ دعوت شیخانِ سہ ہندی وطن

فتاویٰ عالمگیری بھی اسی زمانے کی یادگار ہے جن کے مؤلفین میں حضرت مجددؒ کے تعلق والے زیادہ ہیں۔ اور انھی کے شاگرد ان سلسلہ میں شاہ ولی اللہؒ رم۔ ۱۱۷۶ھ) حضرت مظہر جانِ جاناںؒ رم۔ ۱۱۹۵ء) شاہ غلام علیؒ رم۔ ۱۲۴۰ھ) قاضی ثناء اللہ پانی پتی رم۔ ۱۲۲۵ھ) مولانا خالد رومیؒ، صاحب فتاویٰ شامیؒ، شاہ عبد الغنی مجددی رم۔ ۱۲۹۶ھ) (جن کے شاگرد مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی محمد مظہر سہارنپوری) اور بانیانِ مدرسہ ہائے دیوبند و بریلی وغیرہ پیدا ہوئے۔ پھر ان کے اسباط و اخلاف نے وہ خدمات انجام دیں کہ کسی حکمران کو نصیب نہ ہو سکیں۔

شاہ ولی اللہؒ، مفسرِ قرآن بھی تھے، شارحِ حدیث بھی تھے، فقیہ بھی تھے، متکلم بھی تھے، امام سلوک و تصوف تھے، معلم اخلاق، ماہرِ اقتصادیات، واضعِ مسائلِ سیاست، شارحِ فلسفۂ تشریع اور وہ سب کچھ تھے جس کی ضرورت اس زمانے کے مسلمانوں کو تھی۔ مرہٹوں کا زور توڑنے کے لیے انھوں نے جو مکتوبات[1] احمد شاہ ابدالی اور نجیب الدولہ کو لکھے ہیں اُن سے اُن کی سیاسی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ در اصل نادر شاہ کے حملے (۱۱۵۲ھ، ۱۷۳۹ء) نے مغلیہ سلطنت کو بالکل ہلا کر رکھ دیا تھا۔ سعادت علی خان نے اودھ میں، علی وردی خان نے بنگال میں اور نظام الملک نے دکن میں آزاد حکومتیں قائم

[1] پروفیسر خلیق احمد نظامی نے "شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات" علی گڑھ سے ۱۹۵۰ء میں شائع کیے تھے۔

کر دی تھیں۔ پنجاب میں سکھوں کا اقتدار بڑھنے لگا تھا۔ اور مغربی اور جنوبی علاقوں میں مرہٹوں کا تسلط تھا۔ دہلی میں ایرانی اور تورانی نزاع عروج پر تھا اور امراء ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے مرہٹوں سے مدد لیتے تھے۔ شاہ صاحب کے لکھنے پر احمد شاہ ابدالی نے ۱۱۷۳ھ ۱۷۵۹ء میں پنجاب پر حملہ کیا اور ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کو پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو شکست فاش ہوئی۔ شاہ عالم (ثانی) بہار میں تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے بہت چاہا کہ وہ دہلی آجائے اور وہاں پھر متمکن ہو۔ لیکن وہ نہ آیا اور پھر دہلی کی مغلیہ سلطنت زندہ نہ ہو سکی۔ [1]

مستان شاہ

یہاں مستان شاہ میواتی کا ذکر بھی ضروری ہے۔ یہ مداریہ سلسلے کا فقیر تھا جس کا نہ کوئی گھر تھا نہ در لیکن اس کی جماعت کے تکیے اور ٹھکانے سارے ملک میں تھے۔ بنگال میں اس کی جماعت کی ٹکر ۱۷۶۱ء میں (پلاسی کی جنگ کے چار سال بعد) انگریزوں سے ہوئی۔ اطراف دہلی سے ان کے مجاہدین بنگال جاتے اور گوریلا جنگ کرتے تھے۔ ۱۷۸۴ء تک ان کے معرکے رہے لیکن اسی دوران میں مستان شاہ کا انتقال گوالیار میں ہو گیا۔ پھر بھی اس کے خلفاء میں چراغ شاہ، محراب شاہ، قل شاہ وغیرہ نے انگریزوں سے جہاد جاری رکھا۔ بالآخر انگریز کی منظم قوت اور سازش سے یہ تحریک ختم ہو گئی۔ [2]

[1] ڈاکٹر معین الدین نے ڈھاکہ یونی ورسٹی سے مداریہ پر کتاب شائع کی ہے۔

[2] قاضی ثناء اللہ پانی پتی لکھتے ہیں: "سابق چند بار احمد شاہ درانی (خدایش بیامرزاد) در ہندوستان آمد، بہ مسلمانان ضعف تصدیع رسید و ہیچ بندوبست نہ شد۔ سرداران مسلمانان برہم شدند و ملک لاہور و سرہند در تسلط سکھان رفت۔ حالا مسموع می شود کہ شاہ امان بہ ارادۂ جہاد ایں طرف آید۔ (لوایح خانقاہ مظہریہ۔ مرتبہ راقم الحروف۔ حیدرآباد ۱۹۷۵ء صفحہ ۲۳۹)

اب اس دور کے سب سے بڑے مجاہد اور انگریز کے حریف کا ذکر
کرنا ہے جس کے بغیر اس برصغیر کے مسلمانوں کی "داستان رنگین"
مکمل نہیں کہلائی جا سکتی۔

ٹیپو

بطلِ حریت ٹیپو (بمعنی شیر) اپنے باپ حیدر علی
کی وفات (۱۱۹۵ھ؍۱۷۸۲ء) پر اس کا جانشین
ہوا۔ افواج انگلیسیہ سے اپنے باپ کی طرح برسرِ پیکار ہوا۔ بیدنور
میں انگریزی جرنیل کو شکست دی اور منگلور میں جنرل کیمبل کو محصور کیا۔
وہ چاہتا تھا کہ انگریزوں کا قلع قمع کرے۔ اس لیے نظام دکن کو
اس نے اپنا حلیف بنانا چاہا۔ لیکن اس مقصد میں ناکامی ہوئی۔ اس
نے ۱۱۹۹ھ؍۱۷۸۶ء میں سلطانِ روم کے پاس اپنا سفیر بھیجا۔ زمان
شاہ (والیِ افغانستان) کے پاس بھی قاصد بھیجا، ہندوستان کے
رؤسا نیپال کے راجہ اور شاہ ایران سے بھی مراسلت کی لیکن کہیں
سے کامیابی نہ ہوسکی۔ فرانسیسی تعاون کے لیے بھی اس نے اپنا سفیر
ماریشس بھیجا لیکن انگریزوں نے نظام اور مرہٹوں کی مدد سے ٹیپو
کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ سری رنگ پٹن میں ٹیپو محصور ہوا اور
گولیاں کھاتے ہوتے بھی آخر دم تک لڑتا رہا[1] اس کی بہادری کے
کارنامے اور غداروں[2] کی سازشوں کے واقعات غیر معمولی شہرت

---

[1] ٹیپو کا علم (۱۲۰۴ھ) انڈیا آفس لندن میں محفوظ ہے جس میں نقشبندی
اور قادری بزرگوں کے نام کندہ ہیں DR. GRAHAM BAILEY کی کتاب
STUDIES IN NORTH INDIAN LANGUAGES لندن ۱۹۳۸ء صفحہ ۱۸۶)
دیکھیں۔ [2] ٹیپو سے غداری کرنے والے احسان فراموش سرداروں
میں میر صادق، غلام علی لنگڑا، بدیع الزمان وغیرہ تھے۔

علامہ اقبالؒ نے کہا ہے :- جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن

رکھتے ہیں۔ ۲۸ ذی قعدہ ۱۲۱۳ھ، (۴ مئی ۱۷۹۹ء) کو اس سرفروش مرد مومن نے ابدی حیات حاصل کی اور طاغوتی طاقتوں پر اس کے رعب کا اندازہ اسی بات سے ہو سکتا ہے کہ اس کی لاش کے قریب آنے کی بھی ان کو ہمت نہ ہوتی تھی۔ مولانا ظفر علیخان نے لکھا ہے:-

قوت بازوے اسلام تھی اسکی صولت ‌ ‌ ‌ اُسکی دولت کے دعاگوؤں میں شامل تھے ہنود
کہیں سوتے میں نہ کروٹ یہ مجاہد بدلے ‌ ‌ ‌ اب بھی اس خوف سے ہیں لرزہ براندام حسود
اس کے اُٹھتے ہی مسلمان کا گھر بیٹھ گیا ‌ ‌ ‌ تھا قیامت کا قیام اور قیامت کا قعود
آخری قول یہ اس کا نہ ہمیں بھولے گا ‌ ‌ ‌ جس سے قائم ہوئیں آئین حمیّت کی حدود
"شیر اچھا ہے جسے مہلتِ یک روزہ ملی ‌ ‌ ‌ یا وہ گیدڑ جسے بخشا گیا صد سالہ خلود"

سیّد احمد اور شاہ اسمٰعیل

شاہ ولی اللہ کے بعد ان کے پوتے شاہ محمد اسمٰعیل کی تحریک کو بھی ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے انھوں نے اور ان کے پیر سید احمد بریلوی نے مل کر مسلمانوں کے دینی، اخلاقی اور معاشرتی حالات کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ بدعات اور غلط رسم و رواج کی بیخ کنی کی طرف متوجہ ہوئے، غلط قسم کی پیر پرستی، قبر پرستی، سوئم، چہلم، برسی اور ہندوانہ رسم و رواج کے خلاف قولاً اور فعلاً بڑی جدو جہد کی۔ بہت سے علماء کو اپنا ہم خیال بنایا نکاح بیوگان کی ممانعت کے خلاف تبلیغ کی، تقریریں کیں اور جگہ جگہ عملاً اُن برائیوں کو رکوایا۔ اسی زمانے میں پنجاب کے مسلمانوں پر سکھوں کے مظالم بڑھ رہے تھے۔ پنجاب سے لیکر کشمیر تک وہ لوگ پھیلے ہوئے تھے۔ سید صاحب حج سے واپس ہوئے تو دیکھا کہ پشاور کے کابلی سرداروں نے رنجیت سنگھ سے ہار مان کر اس کی سیادت قبول کر لی تھی سید صاحب نے سکھوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ پہلا معرکہ نوشہرہ کے قریب ۱۲۴۲ھ، ۱۸۲۶ء میں واقع ہوا جس میں بہت سے سکھ کام آئے اور اس کے بعد سید صاحب کا نام خطبہ میں پڑھا جانے لگا

اور وہ امامِ برحق اور خلیفۂ وقت قرار دیے گئے۔ لیکن مسلسل جہاد کی وجہ سے انتظام اور رسد میں فرق پیدا ہوگیا آخر بالاکوٹ کی جنگ میں سیّد صاحب اور شاہ اسمٰعیل بکثرت مجاہدین کے ساتھ ۱۲۴۶ھ، ۱۸۳۱ء میں شہید ہو گئے اور یہ اصلاحی تحریک ختم ہو گئی۔ پھر بھی اس تحریک کے کچھ آثار باقی رہے۔ شاہ اسحٰق دہلوی کے نواسے سید نصیرالدین دہلوی ۱۸۳۵ء میں جہاد کے لیے کھڑے ہو گئے۔ جے پور، جیسلمیر، اور خیرپور کے بے آب وگیاہ ریگستانوں سے گزر کر وہ ڈیرہ غازی خان پہنچے۔ وہاں مزاری بلوچوں کی حمایت میں دیوان مولرام (حاکم ملتان) سے برسرپیکار ہوتے لیکن جب مزاریوں نے سکھوں سے تعلق پیدا کر لیا تو سید نصیرالدین تنہا رہ گئے۔ اس لیے وہ کشمور، شکارپور اور سبی ہوتے ہوئے قندھار پہنچے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شاہ شجاع الملک کو لے کر کابل کے تخت پر قبضہ کرنے کے لیے انگریز جا رہا تھا GRAND INDUS ARMY ان کے ساتھ تھی۔ قندھار میں سید نصیرالدین نے انگریزوں سے سخت مقابلہ کیا اور وہیں شہید ہوتے۔

سید احمد بریلوی کے ایک خلیفہ مولانا ولایت علی عظیم آبادی تھے۔ وہ جہاد میں سید صاحب کے ساتھ تھے۔ لیکن سید صاحب ہی نے ان کو سفیر بنا کر کابل بھیجدیا تھا۔ وہیں ایک وعظ میں انھوں نے ایک فارسی قطعہ "ردِّ شرک" نظم کیا تھا جو اہلِ حدیث حضرات اپنے بچّوں کو حفظ کراتے تھے۔ اُس کے چند اشعار یہ ہیں:۔

فرمودِ رسولؐ آشکارا | من نیز برادرم شمارا
من مشکلِ خود نمی کشایم | بہ غیر مرا کجاست یارا
طاقت نبود سوائے ایزد | درویش و فقیر و اولیارا
جز حق کہ بود دست گیرد | مسکین و غریب و بے نوارا......

اے مومن پاک اے مسلماں　　می خواہی اگر رہِ رضا را
قرآن و حدیث را بسر نہ　　بگذار کلام ماسوا را

ولایت علی سید صاحب نے ابتدا میں آپ کو دکن بھیج دیا تھا۔ لیکن بالاکوٹ کی ہزیمت کے بعد آپ پٹنہ آگئے اور ہر مرکزی مقام کے لیے اپنے داعی مقرر کیے اور اپنے بھائی عنایت علی کو بنگال بھیجا۔ ولایت علی پھر حجاز چلے گئے اور واپس آنے کے بعد سرحد پہنچے اور تحریک جہاد کو دوبارہ زندہ کیا۔ چند سال بعد پنجاب "کمپنی بہادر" کے قبضے میں آگیا اور کشمیر راجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت ہوا۔ اسی کے ساتھ ہزارہ بھی فروخت ہوگیا۔ لیکن وہاں کے لوگوں نے گلاب سنگھ کا مقابلہ کیا اور ولایت علی سے مدد چاہی۔ انگریزوں نے گلاب سنگھ کی مدد کی اور مولوی ولایت علی گھیر لیے گئے۔ پھر دو سال کے لیے (۱۲۶۴ھ، ۱۸۴۹ء) میں نظر بند کر دیے گئے۔ مولوی صاحب کے انتقال (۱۲۶۹ھ، ۱۸۵۳ء) پر ان کے بھائی عنایت علی پوری جماعت کے امیر بنا لیے گئے۔ لیکن پھر ۱۸۶۱ء میں اس جماعت کے بہت سے مجاہدین کو کالے پانی پہنچا دیا اور اس طرح بالآخر یہ تحریک ختم ہوگئی۔

فرائضی تحریک اسی طرح ایک اور تحریک ختم ہوئی۔ وہ حاجی شریعت اللہ فرائضی کی تھی۔ ہوا یہ ہے کہ کارنوالس نے بنگال میں زمین کا استمراری بندوبست نافذ کر دیا تھا۔ اس طرح ہندوؤں نے کوڑی کے مول وہاں کی زمینیں لے لی تھیں جن سے مسلمانوں کو زک اٹھانا پڑی۔ وہ مزارع تھے اور ان سے داڑھی ٹیکس اور رچولہا ٹیکس بھی وصول کیا جاتا تھا۔ اس طرح ان کی زندگی اجیرن ہوگئی تھی۔ حاجی شریعت اللہ ان مظالم سے نجات دلانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے لیکن انھوں نے دین کے احکام کو صرف

فرائض تک محدود کردیا۔ اس لیے وہ فرائضی کہلانے لگے۔ وہ زکوٰۃ
اور عشر وصول کرتے تھے۔ لیکن انھوں نے بنگال کو دارالحرب قرار
دیکر جمعہ اور عیدین کی نمازیں ساقط کردیں۔ ہندوؤں کے مظالم
کے خلاف انھوں نے طاقت استعمال کی۔ انگریزی دستے ہندوؤں کی
مدد کرتے تھے اور مسلمانوں کی بستیوں کو اجاڑ دیتے تھے۔ غالباً
۱۸۰۱ء سے ۱۸۱۸ء میں شریعت اللہ کے انتقال تک یہ تحریک
قوت کے ساتھ قائم رہی۔ پھر ان کے بیٹے محمد محسن اور خلیفہ نثار علی
نے بڑے حوصلے سے جنگیں کیں۔ آخر کار انگریز نے ان سب کو مقدمات
میں پھانس دیا اور ان کا زور توڑ دیا۔ یہ تحریک کسی نہ کسی طرح ۱۸۴۰ء
تک چل کر ختم ہوئی اور اس کے غلط مذہبی اثرات کی اصلاح مولوی
کرامت علی جونپوری رح نے ۱۸۷۳ء تک قریب ۳۰ سال کی تبلیغ سے مکمل کی۔

انگریز

ہم نے اوپر شاہ ولی اللہ رح اور مختلف بزرگوں کی تحریکات آزادی
کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے انیسویں صدی عیسوی تک
کے حالات کا جائزہ لے لیا ہے لیکن اب انگریزوں کی چند عنایتوں کا ذکر
کرنا ہے کہ انھوں نے ۱۸۵۷ء کے ناروا حالات اور ان کے اسباب کس
طرح پیدا کیے۔ ملک میں مسلمانوں کی طاقت مغلوب ہو چکی تھی۔ انگریز
نے مسلمانوں اور ہندوستانیوں کے ساتھ نفرت اور حقارت کا سلوک
کیا۔ اودھ کے والی واجد علی شاہ کو ۱۸۵۶ء میں معزول کیا۔ بہادر شاہ ظفر
اگرچہ نام کا بادشاہ رہ گیا تھا لیکن پھر بھی بابر کی اولاد میں سے تھا۔ اس
کو قلعہ سے نکل جانے کا جب حکم دیا گیا اور اس کی بادشاہی کا خطاب
چھین لیا گیا تو انگریزوں کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی پھر ہندو راجاؤں
کی تذلیل کی گئی۔ مرہٹوں کے پیشوا کے متبنیٰ کو وظیفے سے محروم کردیا گیا۔ ان
کی ریاستوں (ناگ پور وستارہ) پر غاصبانہ قبضہ کرلیا گیا۔ جھانسی کی رانی

لکشمی بائی کو متبنّیٰ بنانے کے جائز حق سے محروم کر کے قوم سے نفرت مول لی گئی۔
سندھ کے امیروں کو بھی تخت و تاج سے محروم کیا گیا۔ جنوبی ہند میں نواب
کرناٹک اور راجہ تنجور کو خطابات سے محروم کر دیا گیا۔ نظام سے
برار چھین لیا گیا۔ ہندوستانیوں کو کھلم کھلا عیسائی بنایا جانے لگا۔
ویلور کے سپاہیوں نے جب ذلت آمیز سلوک کے خلاف احتجاج
کیا تو انھیں گولیوں سے اڑا دیا گیا۔ بنگال کے سپاہیوں نے ملک سے
باہر جانے کا مزید الاؤنس طلب کیا تو ان کے اس مطالبے کو بغاوت قرار
دیتے ہوئے انھیں گولیوں سے اڑا دیا گیا۔ ہندوستانی سپاہیوں کو سوٗر
کی چربی لگے ہوئے کارتوسوں کو دانت سے توڑنے پر مجبور کیا گیا۔ اس طرح
کے بہت سے اسباب تھے جن کی بنا پر سپاہیوں نے اندر ہی اندر صلاح و
مشورہ کر کے جا بجا انگریزوں کے خلاف بغاوتیں شروع کر دیں۔ سب
سے پہلے ۱۰ رمئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کے سپاہیوں نے کھلّم کھلّا بغاوت
کر کے انگریز افسروں اور ان کے متعلّقین کو قتل کر دیا اور جیل میں
جو ۸۵ محبّانِ وطن قید تھے ان کو رہا کرایا اور ہر سرکاری عمارت کو
آگ لگا دی۔ "دہلی چلو، دہلی چلو" کے نعرے بلند ہوتے تو عوام
بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔ پھر دوسرے شہروں میں ہنگامے شروع ہو گئے
اور یہ انقلابی لوگ مسلسل ساڑھے چار ماہ تک انگریزوں کی منظّم
فوجوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے لیکن نظام، سکھ اور راجہ نیپال
کی مدد سے انگریز غالب آ گیا۔ اور اس نے ہندوستانیوں پر ایسے
مظالم ڈھائے کہ انسانیت لرز جاتی ہے۔ ۱۸۵۸ء میں دہلی پر انگریزوں
کا قبضہ ہو گیا۔ اور بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر کے ان کی آنکھوں کے
سامنے ان کے جوان بیٹوں کو گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ بلکہ ہڈسن نے جو
(فوج کا جنرل تھا) ان کا خون بھی پیا۔ اس جنگ آزادی کی ناکامی کے

بعد ہندوستانی لوگ مغلوب ہو گئے۔ کمپنی کی حکومت کی جگہ اب "وزیر ہند" کا عہدہ قائم کر دیا اور ملکہ وکٹوریہ نے ہندوستانیوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ہندوستانیوں میں سب سے زیادہ مسلمان معتوب ہوئے کیونکہ انھی سے حکومت چھینی گئی تھی۔ بلکہ اب تو انگریز کا دماغ اس طرح سوچنے لگا کہ ہر وہ چیز جو انگریز کے مفاد کے خلاف نظر آئے اس کی تہ میں مسلمان ہی کا ہاتھ ہوگا۔ چنانچہ ان کی جاگیریں بھی ضبط کی گئیں۔ اُن کی تجارت بھی مسدود کی گئی اور ملازمتوں سے بھی محروم کیا گیا۔ ایسے حالات میں سرسیّد نے مسلمانوں کو جدید علوم و فنون کی دعوت دی اور انھیں سمجھایا کہ اب انگریزوں سے زبانی نفرت بالکل بے معنی ہے۔ کیونکہ اب ان سے مقابلہ کرنے کی اہلیت اور طاقت باقی نہیں۔ سنہ ۱۸۷۵ء میں سرسیّد نے علی گڑھ کالج قائم کیا اور اس وقت سے مسلمانوں کی جتنی سیاسی تحریکیں برصغیر میں وجود میں آئی ہیں ان میں بلا واسطہ یا بالواسطہ علی گڑھ والوں ہی کا ہاتھ رہا ہے۔

ملکی سیاست

اس میں کوئی شک نہیں کہ برصغیر کی سیاست میں ہندوؤں نے بہت کچھ حصّہ لیا۔ تلک، بپن چندرا پال اور کھاپرڈے نے کانگریس کو انگریزوں کے خلاف ضرور تیّار کیا تھا لیکن یہ محض ظاہر داری تھی کیونکہ انھوں نے اس کانگریس کے علاوہ ایک ہندو جماعت کی تشکیل بھی کی تھی۔ اور ان کے برعکس دادا بھائی نوروجی، فیروز مہتا اور گوکھلے نے برصغیر کی تمام جماعتوں کو متحد کرنے کی کوشش کی تھی (قائداعظم) محمد علی جناح بھی ان کے ساتھ ہو گئے تھے۔ پھر جب ترکی سلطان عبدالحمید کا زوال ہوا اور اٹلی نے طرابلس الغرب پر حملہ کر دیا تو ہندوستان کے

مسلمانوں کو سخت صدمہ ہوا۔ مولانا ظفر علی خان وغیرہ نے چندہ فراہم کیا اور طبی وفد کے ساتھ قسطنطنیہ گئے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد "علی برادران" ۱۹۱۸ء میں تحریک خلافت شروع کی تھی بلکہ محمد علی جوہر نے خلافت عثمانیہ کے احیاء کے لیے انگلستان کا دورہ بھی کیا تھا۔ ۱۹۲۳ء میں بنگال کے سی۔ آر۔ داس نے مغرب کے خلاف ایشیا والوں کو متحد کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکی۔ انگریز نے ۱۹۲۷ء میں "سائمن کمیشن" مقرر کیا کہ وہ معلوم کرے کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کہاں تک ہندوستانیوں کے لیے قابل عمل ہے، اور ہندوستان میں ذمہ دار حکومت کن اصولوں پر قائم ہوسکتی ہے۔ یہ کمیشن ۱۹۲۹ء میں ہندوستان آیا۔ تو ایک بار پھر ہندو اور مسلمان متحد ہوئے۔ اس کمیشن کا بائیکاٹ کیا گیا (کیوں کہ اس میں ہندستانیوں کو شامل نہیں کیا گیا تھا) اسی کے خلاف قائد اعظم کے چودہ نکات تھے۔ جن میں خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ رکھا گیا تھا۔ آخر اس کمیشن نے یہ تجویز پیش کی۔ کہ ہندوستان کے اور ریاستوں کے نمائندوں کو گول میز کانفرنس میں ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۳ء بلایا جائے۔ قائد اعظم نے اس میں شرکت کی لیکن وہاں کے حالات سے مطمئن نہ ہوکر انھوں نے مسلم لیگ کو مضبوط بنانے کی کوشش کی اور علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں مسلمانوں کے لیے ایک نیا گھر (پاکستان) بسانے کی تجویز پیش کی۔ لاہور میں مسلم لیگ نے ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان منظور کی اور ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرض وجود میں آیا۔

بے محل نہ ہوگا اگر یہاں چند تلخ حقیقتیں بھی عرض کر دی جائیں۔ انگریز بڑا عیار تھا اور شروع ہی سے اس کی پالیسی "پھوٹ ڈالو اور حکومت

"کرو" تھی۔ پہلے تو اُس نے ہندوستان کے مختلف راجاؤں اور حکمرانوں کو استعمال کیا۔ کمزور کا ساتھ دے کر مضبوط کو ہرایا اور جب مضبوط ختم ہوگیا تو اپنے تسلط کو وسیع سے وسیع تر بنایا۔ سنہ ۱۸۵۰ء کے بعد (جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں) مسلمان تو بالکل ختم ہوگیا اور جہاں کہیں تھوڑی بہت اس کی رمق دیکھی گئی اس کا انسداد اور استحصال کر دیا گیا۔ بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری سنہ ۱۸۵۷ء میں عمل میں آئی اور آخر وہ رنگون میں سنہ ۱۸۶۲ء میں فوت ہوگئے۔

ایک اور تحریک

اسی سال مجاہدین اسلام نے متفق ہو کر شمالی و مغربی سرحد میں جمع ہو کر اچانک نعرۂ جہاد بلند کیا۔ اور ہزاروں مسلمان ان کے جھنڈے کے تلے جمع ہوگئے۔ لارڈ ایلگن (وائسرائے) کی فوجیں حرکت میں آگئیں لیکن انگریز فوجوں کو تقریباً ہر مورچے پر شکست ہوئی۔ ایسے حالات میں انگریز نے اپنی عیاری سے فوراً کام لیا۔ اور پٹھان سرد[illegible]ن کو اپنے ساتھ (مختلف قسم کے لالچ دیکر) شامل کر لیا۔ [illegible] کو وہابی کا لقب دیکر بڑی طرح تباہ کیا اور [illegible] انگریز [illegible] خطرے سے نجات حاصل ہوئی جو سنہ ۱۸۵۷ء کے معرکے سے زیادہ خطرناک تھا۔ لیکن انھی مجاہدین میں سے بہت سے لوگ دہلی کے تھے جو سرحد میں شکست کے بعد وطن واپس آگئے تھے۔ اس لیے ان کے درمیان پھوٹ ڈالنے کے لیے ایک نیا شوشہ چھوڑا گیا۔ وہ

حرف ض کا شوشہ

یہ کہ پنجاب سے ایک مولوی حبیب اللہ آئے اور انھوں نے کہا کہ تم لوگ حرف "ض" غلط ادا کرتے ہو۔ اس طرح یہ فتنہ اتنا بڑھا کہ جنگ و جدال اور کشت و خون عام ہوا۔ یہ واقعہ سنہ ۱۲۸۰ھ ۱۸۶۳ء

کا ہے۔ قاری عبدالرحمن پانی پتیؒ (م ۱۳۱۴ھ، ۱۸۹۶ء) اسی سلسلے میں تحفۂ نذریہ کے دیباچے میں لکھتے ہیں :۔

"بر سالکان مسلک نصفت مخفی مباد کہ در حدود سنہ ثمانین و مائتین بعد الف من ہجرتہ علیہ السلام در بعض بلاد ہند در تلفظ حرف ضاد اختلاف عظیم افتاد۔ اکثر مردم بسبب کم مشقی خود ضاد را دال مفخم ادا می کردند۔ چنانچہ ائمۂ قراء پیوستہ در تصانیف خود ہا ازیں غلطی تحذیر می کردہ آمدہ اند تحریص و تاکید بر اخذ استاد ماہر می کردند و بعض مردم ایں دیار چون از صحبت استاد ماہر محروم بودند و بسبب کسل خود تلاش استاد ماہر نہ کردند و پنداشتند کہ تلفظ ضاد بمطالعۂ کتب قرارت می تواں کرد۔ چوں ضاد را در اکثر صفات با ظا مشابہ یافتند وہم بعض اہل تصانیف بنظر ہمیں تشابہ صفات ضاد را باظا مشابہ نوشتند۔ پس گمان کردند کہ ضاد را مانند ظا ادا باید کرد تا آنکہ جواز نماز در ظا حصر کردند وہر کہ ضاد را ظا تلفظ نمی کرد نمازش و امامتش را جائز نمی داشتند و بنظر تعصب شان از روایات فقہیہ کہ از تلفظ ظا بجائے ضاد عمداً نماز فاسد می شود کو رشد و طعن و تشنیع دریں باب بلند شد و دام تلبیس ابلیس پہن شد ...."

در اصل ضاد ایک ایسا حرف ہے جو صرف عربی میں ہے اور اس کے ادا کرنے کا طریقہ کسی ماہر استاد ہی سے سیکھا جاسکتا ہے جو مشکل بھی نہیں۔ تاہم اس ایک حرف کی وجہ سے بہت کچھ جدال و قتال ہوا اور ایسی پھوٹ پیدا کر دی گئی جو آج تک بعض علماء میں قائم ہے اور بہت سے لوگوں کو۔ اسی ایک حرف کی بدولت آج بھی "وہابی" کا لقب حاصل ہے۔

مسیحیت اور آریہ سماج پھر فتنۂ مسیحیت کو فروغ ہوا جس کا مقابلہ ڈاکٹر وزیر خان، مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور مولانا منصور علی خان دہلوی نے کیا۔ اور فتنۂ آریہ سماج کا مقابلہ مولانا قاسم نانوتوی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا عبدالحق حقانی، محمود دھرم پال، بابا خلیل داس وغیرہ نے کیا۔

ایک پیغمبر پنجاب میں مسلمانوں کا زور تھا تو وہاں ایک "پیغمبر"[1] کو پیدا کیا گیا تاکہ زیادہ سے زیادہ پھوٹ ڈالی جاسکے اور انگریز کے خلاف جہاد کو بھی منسوخ کیا جاسکے۔ پھر بھی یہ مسلمان ختم نہ ہوتا تھا تو اس کے درمیان خلیج وسیع کرنے کے لیے دیوبندی اور بریلوی جھگڑے شروع کرائے گئے۔ رفع یدین، فاتحین، میلاد شریف میں قیام، سوم، چہلم، حی علی الصلوٰۃ کہنے پر جماعت کے لیے کھڑا ہونا، بہت سی فروعات پر جدال وقتال کرایا گیا۔

کہا گیا کہ ہر مسلمان کافر ہے ایک عالم نے اپنے شجرۂ قادریہ میں تو یہاں تک لکھ دیا کہ دیوبندی (جو دیو کے بندے ہیں) کافر ہیں، اہلحدیث کافر ہیں، ندوی کافر ہیں وغیرہ۔ اور جو شخص ان کو کافر نہ سمجھے وہ بھی کافر ہے۔ اور یہ فتنہ[2] آج بھی قائم ہے۔ البتہ آریہ سماج اور شدھی سنگھٹن والا فتنہ پاکستان بننے سے پہلے تک بہت قوت پکڑے ہوئے تھا۔ بعض شہروں میں مستقل طور پر ہر سال ہندو مسلم فسادات ہوا کرتے تھے جو ہندوستان

---

[1] اسی پیغمبر کا ایک خلیفہ "دکن میں "صدیق" بنا ہوا تھا۔ [2] آج بھی ایک طبقہ صرف خود کو مسلمان کہتا ہے اور کسی غیر طبقے والے کے پیچھے نماز نہیں پڑھتا۔ بلکہ حرمین شریفین میں بھی الگ نماز پڑھتا ہے۔

ہیں اب بھی ہیں۔ لیکن پاکستان کے ہندوؤں نے خالصتہً لسانی جھگڑوں کو زیادہ اُچھالا، کیونکہ اسی طرح ان کا بچاؤ ہوسکتا ہے اور ان کی طرف سے توجہ ہٹ سکتی ہے۔ لہ

نوجوانوں کا بے مثل ایثار

پاکستان بن جانے کے بعد حزب الشیطان نے زیادہ توجہ علاقائی عصبیت پر مبذول کی اور ہر طبقہ اسی عصبیت کو ذہن میں رکھ کر ملازمتوں میں گھسنے لگا۔ پھر ایسا دور آیا کہ سندھ کی حدود پر ہندوستان کے ہندوؤں کو آباد کیا گیا۔ لسانی ہنگامے اسی کے نتیجے میں رونما ہوئے اور بہت سے بے گناہ مسلمان مارے گئے۔ پھر ایسا وقت بھی آیا کہ پاکستان کو "سرخ" قرار دیا گیا اور دین کی حمایت کرنے والوں کو گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ لیکن گولی کھانے والوں میں بکثرت وہ نوجوان تھے جو بڑے بڑے بال رکھتے تھے اور رنگین کپڑے پہنتے تھے۔ اور جن کے متعلق کوئی شخص سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان کا کوئی تعلق دین سے ہے بھی یا نہیں۔ پھر اللہ کا بےحد احسان ہوا کہ اس شدید اضطراب اور تشدّد کے بعد ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو "اسلامی انقلاب" رونما ہوا اور قوم کو سکون کی زندگی حاصل ہوئی۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ادب کا ذکر بھی کر دیا جائے۔

اُردو ادب

دین سے دوری پیدا کرنے کے لیے خود دین کو بھی استعمال کیا گیا تھا اور ادب کو

لہ جبل پور کی مسجدوں کے دروازے پر گائے بندھی ہوئی کھڑی رہتی تھی۔ مسجد کے سامنے سے ہندو اگر باجے بجاتا ہوا گزرتا تھا تو اسی وقت وہ گائے بلند نعرۂ تکبیر کے ساتھ ذبح کی جاتی تھی اور اسے کفارہ کہا جاتا تھا۔

بھی ۱۹۳۵ء اردو ادب میں حقیقت نگاری کے نام پہ عریانی اور بے حیائی کا آغاز ہوتا ہے اور اس کا نام ترقی پسند ادب رکھا جاتا ہے۔ اس تحریک کی ابتدا سجاد ظہیر، احمد علی اور ڈاکٹر رشید جہاں نے کی۔ اور انگارے کے نام سے افسانوں کا مجموعہ شائع کیا جس میں مذہب و اخلاق پر حملے کیے گئے اور اشتراکی نظریات کی تبلیغ کی گئی ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد پڑی اور اس کے اراکین نے حقیقت نگاری کا لبادہ اوڑھ کر مذہب، اخلاق، تہذیب اور ان کی اقدار کو لغو قرار دیا بلکہ محض جہالت اور اوہام کہا گیا۔ بقول عزیز احمد :۔ " وہ (ترقی پسند ادیب) روحانی، اخلاقی یا جمالیاتی اقدار کا پابند نہیں۔ اسے جو موضوع پسند آئے یا زندگی کے جس پہلو سے وہ اچھی طرح واقف ہو اپنی تصنیف میں استعمال کر سکتا ہے۔ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ اسے غلیظ سے غلیظ باتیں لکھنے کی اجازت ہے۔"

چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں گندگی کا ڈھیر لگ گیا جس کی حمایت بھی ترقی پسند نقادوں نے خوب کی۔ ایسی شاعری اور ایسی نثر کی بنیاد اشتراکی فلسفے پر رکھی گئی جس کے نزدیک اصل حقیقت مادہ ہے۔ اور اس کے مقابلے میں روح اور خدا کوئی چیز نہیں بلکہ مادّی ارتقاء ہی میں احساس، شعور، عقل اور ضمیر کی تخلیق ہوتی ہے۔ مذہب کو محض فریب تخیل اور استحصالی طبقوں کا آلۂ کار کہہ کر اس قسم کے ادب نے خدا اور دین سے بیزاری پیدا کرائی۔ فکر تونسوی، مخمور جالندھری، احمد فراز، علی سردار جعفری وغیرہ نے اس ادب میں بڑے جوہر دکھائے اور ایک ایسا انداز اختیار کیا جس میں خدا کی عظمت کا اعتراف کر کے' اس کی شکایت اور پھر اس سے بغاوت

کی گئی ہے۔

اس تحریک کو فرائڈ اور مارکس کے نظریات سے بہت مدد ملی۔ فرائڈ نے انسان کے نفسیاتی ماحول اور سماجی تربیت کا مرکز روٹی کے بجائے جنس کو قرار دیا۔ اُس کے خیال میں "انسانیت دوستی دراصل اس تشنہ کام جنسی جذبے کے لیے ایک اعلیٰ راستہ نکالنے کی کوشش ہے جو تسکین نہیں پاتا اور پاک عشق و محبت محض فطری جنسی جذبے کو اخلاقی اور سماجی تصورات کے ماتحت کچل دینے والی بد دیانتی اور خود فریبی کا عکس ہے لہٰذا گناہ اور ثواب، نیکی اور بدی، پاکیزگی اور عفونت، عظمت اور پستی کا کوئی ایسا معیار قائم نہیں کیا جا سکتا جو ہر حالت کے لیے صحیح قرار دیا جا سکے"۔ اس نظریے والے کے نزدیک اچھائی اور برائی کا کوئی مستقل معیار باقی نہیں رہا۔ اس لیے اس نظریے والا گروہ جو ترقی پسندوں میں داخل ہوا اُس نے بے حیائی اور گندگی کے ڈھیر لگا دیے۔ ترقی پسند مصنفین نے جب جنسی انارکی کے خلاف لوگوں کا شدید ردّ عمل دیکھا تو انھوں نے فریب دینے کے لیے ۱۹۴۹ء میں ایک قرارداد منظور کی جس کی رُو سے یہ اعلان کرنا چاہا کہ وہ بھی جنسی انارکی کے خلاف ہیں۔ لیکن ان کا یہ دعویٰ بالکل غلط ہے۔ کیونکہ اس اعلان کے بعد بھی ان کے ادب میں وہی غلاظت نظر آتی ہے۔ اس رُجحان کو تقویت مارکس کے ماننے والوں سے بھی ملی۔ جن کا یہ نقطۂ نظر ہے کہ "ہر دور کا معاشی نظام اس دَور کے سماجی نظام کو متعیّن کرتا ہے"۔ ان کے نزدیک انسانی صفات اور اخلاق کی بلندی اور پستی کی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے بلکہ ہر دَور کا معاشی نظام اپنی ضروریات اور تقاضوں کے لحاظ سے اپنے زمانے کی اخلاقی قدروں کو جنم دیتا ہے۔ چنانچہ زندگی کے مادّی

تصوّر کے ساتھ ساتھ اس قسم کے خیالات نے ادب میں زبردست فکری اور ذہنی انتشار پیدا کیا۔ تاہم اسلامی نظریات کی ترجمانی کرنے والے اور مسلمانوں کے جذبات و احساسات کا پاس رکھنے والے کچھ ادباء ضرور ہوئے اور اب زیادہ ہیں۔ پھر بھی ترقی پسند ادب اب بھی سیکولر طرزِ فکر کی طرف لے جانے کا کام کرتا رہتا ہے گو کہ قیامِ پاکستان کے بعد اس کا زور ٹوٹ گیا ہے اور اس رجحان کے توڑ کے لیے اسلامی ادب کی تحریک بہت کچھ ترقی پذیر ہے۔

نعت گوئی، اخلاقی نظمیں، اخلاقی مضامین، متصوفانہ تحریریں وغیرہ عام ہو رہی ہیں اور اسلامی ادب کی یہ تحریک غیر اسلامی رجحانات کی نفی بھی کر رہی ہے اور مذہب دشمن نظریات کو زک بھی پہنچا رہی ہے اور وہ جو مارکسی نظامِ فکر میں اقتصادی عنصر کو زندگی میں غالب ترین اور فیصلہ کن قوّت مانا گیا ہے اس کے توڑ میں اسلامی ادب کا اخلاقی عنصر زیادہ قوی ثابت ہو رہا ہے اور اخلاقی قدریں غالب ہونے لگی ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم میں روسی بلاک ایٹمی طاقت کے معاملے میں مغربی طاقتوں سے پیچھے تھا۔ اس لیے اس نے عالمی امن کی سرد جنگ چلائی تھی۔ اردو میں ترقی پسندوں ہی نے اس رجحان کو عام کرنا چاہا تھا اور اپنی تخلیقات میں جنگ کے خطرے کا ذمہ دار مغربی بلاک ہی کو ٹھہرایا تھا۔ اور اس طرح روسی جارحیت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی تھی اس یکطرفہ رجحان کے برخلاف اسلامی ادب نے سرد جنگ کی صحیح تصویر پیش کر دی اور اپنی تخلیقات میں دونوں بلاکوں کے استعماریت پسند رجحانات پر تنقید کی۔ اور بحمد اللہ ۵ رجولائی ۱۹۷۷ء کے "اسلامی انقلاب" نے اسلامی رجحانات کو عام کر دیا اور ہمارے ادباء خود کو مسلمان کہلانے

میں فخر محسوس کرنے لگے ہیں۔

اسلامی انقلاب اس وقت پاکستان کی ذہنی اور عملی کثافت کو دور کرنے کے لیے صحیح قسم کے علماء اور صوفیہ کے علاوہ دو[1] جماعتیں خصوصیت سے دین کا کام کر رہی ہیں۔ ایک تبلیغی جماعت ہے جس کے بانی مولانا محمد الیاس (م۔ ۱۹۴۴ء) تھے۔ یہ جماعت تمام دنیا میں دورے کر کے لوگوں کی دینی اصلاح پر متوجہ ہے اور اسے سیاست سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ دوسری جماعت اسلامی ہے جس کے بانی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (م۔ ۱۹۷۹ء) تھے جنھوں نے قیام پاکستان کے بعد ہی سیاست میں عملی حصّہ لیا۔ اور ۱۹۵۳ء میں قراردادِ مقاصد منظور کی جس میں اللہ کی حاکمیت اور شریعت کی بالادستی تسلیم کی گئی۔ مولانا کے بعض نظریات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن ان کی بے لوث دینی خدمت سے انکار نہیں ہو سکتا۔[1]

"اسلامی انقلاب" کو رونما ہوتے تینتیس سال ہو رہے ہیں[2] اور اللہ پاک نے اس قلیل عرصے میں ایک مردِ حق پرست کے ہاتھوں وہ کام کرا دیئے ہیں جو اس سے پہلے تیس سال میں بھی نہیں ہوتے تھے اور یہ ملک جو ہماری سازشی اور غداری کی وجہ سے آدھا رہ گیا ہے آج دوست اور دشمن دونوں کی نظروں میں بڑی اہمیت حاصل کر چکا ہے۔ اللھم احفظنا من کل بلاء الدنیا وعذاب الآخرۃ۔

---

[1] افسوس کہ جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت دونوں کو ہمارا ایک طبقہ کافر کہتا ہے لیکن وہ ان کو ضرور مسلمان سمجھتا ہے جن کے کافر ہونے کے متعلق "لیغیظ بھم الکفار" (سورۃ الفتح) والی آیت ہے۔

[2] یہ مضمون ۱۹۸۰ء کا تحریر کردہ ہے۔

مسلمانوں کا علم و ادب برّصغیر میں

(الف) عربی علم و ادب:

برصغیر پاک و ہند میں پچیس صحابۂ کرامؓ تشریف لائے۔[1] ارمیل یا ارمابیل (موجودہ لسبیلہ) اور سیستان۔ (بلوچستان سے ملحق جنوب مشرقی ایران) میں بھی قیام فرمایا۔ پھر ۱۷ سالہ محمد بن قاسم نے ۹۳ھ / ۷۱۲ء میں سندھ کے مشہور بندرگاہ دیبل[2] (بھنبھور) کو فتح کیا۔ راجہ داہر مارا گیا۔ پھر برہمن آباد (منصورہ) بھی مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔ اسی پہلی صدی ہجری میں ۳۶ تابعین نے بھی یہاں قدم رنجہ فرمایا اور ان کی برکت سے نہ صرف دین کی تبلیغ ہوئی بلکہ تہذیب و شرافت اور صنعت و تجارت کی بنیادیں استوار ہوئیں۔ دوسری اور تیسری صدی ہجری میں بھی بکثرت تابعین رضی اللہ عنہم اور تبع تابعین رضی اللہ عنہم کے ورود مسعود کا پتا چلتا ہے۔ ابوالحسن مدائنی (المتوفی ۲۲۵ھ/۸۴۰ء) نے سندھ کی پہلی تاریخ لکھی جس کا فارسی ترجمہ "چچ نامہ" علی بن حامد نے ۶۱۳ھ/۱۲۱۶ء میں کیا۔ بلاذری (المتوفی ۲۷۹ھ/۸۹۲ء) کی فتوح البلدان اور بزرگ بن شہریار (جو ۲۸۸ھ/۹۱۰ء میں منصورہ آیا) کی عجائب الہند یہاں کی قدیم تاریخ کے ماخذ ہیں۔[3] اصطخری جس نے ۳۴۰ھ/۹۵۱ء میں برصغیر کا سفر کیا تھا کتاب الاقالیم میں لکھتا ہے کہ منصورہ اور

۱۔ محمد اسحٰق بھٹی صاحب کی کتاب "فقہائے ہند"، (جلد اول لاہور ۱۹۷۴ء)

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

ملتان کے لوگ عربی اور سندھی دونوں زبانیں بولتے ہیں۔ علم ہیئت میں سنسکرت کی ایک کتاب سدھانت کا عربی ترجمہ السند ہند کے نام سے دوسری صدی ہجری میں ہوا۔ علم طب میں سشرت اور چرک اور حکمت و دانش میں پنچ تنتر کے ترجمے بھی عربی میں ہوئے۔ اس طرح یہاں کے علوم کو اسلامی ممالک میں قبول عام حاصل ہوا۔

چوتھی صدی ہجری تک اسلامی دنیا کی مشترک علمی اور ادبی زبان عربی تھی۔ محمود غزنوی (المتوفی ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء) کے زمانے میں فارسی کو فروغ حاصل ہوا اور سامانی عہد کے فارسی قصائد (اور غزلیں) جو بالکل سیدھے سادے الفاظ میں تھے، اب تشبیہات و استعارات

(حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ)
میں ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین رضی اللہ عنہم اور تبع تابعین رضی اللہ عنہم اور آٹھویں صدی ہجری تک کے بزرگوں کا ذکر اور ان کے کارنامے درج ہیں۔ سندھ گزیٹر (مطبوعہ کراچی ۱۹۰۷ء) کے صفحہ ۹۱ میں ٹھٹھہ کے قریب گجو کے بزرگ ابوتراب کے کتبے کی تاریخ ۱۷۱ھ مطابق ۷۸۸ء لکھی گئی ہے لیکن ڈاکٹر محمد شفیع مرحوم نے صنادید سندھ (صفحہ ۹) میں لکھا ہے کہ اس کا صحیح سال عیسوی والا ہے۔ ہجری والا نہیں ہوگا۔ یعنی ۷۸۸م رسالہ بینات (کراچی اگست ۱۹۷۴ء) میں مولانا اللہ بخش کا مضمون "وادیٔ سندھ کا علمی فیضان" بھی دیکھیں۔ مولانا غلام علی آزاد کی سبحۃ المرجان (صفحہ ۶۶) میں ابوحفص ربیع بن صبیح کا ذکر ہے جو ۱۶۰ھ میں سندھ آگئے تھے وہ راوی حدیث اور مصنف بھی تھے۔

۲۔ بھنبھور کی جامع مسجد کا ایک کتبہ ۱۰۹ھ کا ہے اور دوسرا ۲۹۴ھ کا ہے۔

۳۔ مولانا سلیمان ندوی نے "عرب و ہند کے تعلقات" (الہ آباد ۱۹۳۰ء) میں متعدد عرب سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں کا ذکر کیا ہے۔

اور تسلسل مضامین کے لیے مختص ہوئے۔ عنصری، فرخی، منوچہری، فردوسی وغیرہ کے شاہکار اب بھی محمودی شان وشوکت کے شاہد ہیں اور یہ سب فارسی میں ہیں۔ البتہ ابوریحان البیرونی (المتوفی ۴۴۰ھ/۱۰۴۸ء) نے عربی میں کتاب الہند لکھی وہ ہیئت، نجوم، تاریخ، جغرافیہ، کیمیا، طبیعیات اور معدنیات وغیرہ علوم میں تبحّر رکھتا تھا اور بکثرت زبانوں سے واقف تھا۔ خود محمود غزنوی نے فقہ میں التفرید فی الفروع کتاب لکھی تھی۔ اسی دور میں فارسی میں تصوّف کی (غالباً) سب سے پہلی نثری کتاب" داتا گنج بخش" علی بن عثمان ہجویری لاہوری (م۔ ۴۶۹ھ/۱۰۷۶ء) کی کشف المحجوب ہے[۱] انھوں نے ابو القاسم قشیری (م۔ ۴۶۵ھ/۱۰۷۳ء) کا زمانہ پایا تھا جو عربی رسالۃ القشیریہ کے مصنّف ہیں۔ پھر شیخ محمد اسماعیل (م۔ ۴۴۸ھ/۱۰۵۶ء) بھی قدیم محدّث و مفسّر ہیں جو عرب سے آکر لاہور میں قیام پذیر ہوئے۔

عنصری کی وامق و عذرا نے عشقیہ مثنویوں کے لیے راہ ہموار کر دی اور ہمارے ملک میں اس وقت سے بہت سی ایسی مثنویاں لکھی جانے لگیں۔ اسی طرح سنائی (م ۵۴۵ھ/۱۱۹۰ء) کی پہلی متصوّفانہ مثنوی حدیقۃ الحقیقت کی وجہ سے تصوّف کی مثنویوں کا آغاز ہوا۔ ابو الفرج رونی (م۔ ۴۹۷ھ/۱۱۰۳ء) اور مسعود سعد سلمان (م۔ ۵۱۵ھ/۱۱۲۱ء) ہمارے ملک کے مایۂ ناز شعراء ہیں۔ اسی زمانے میں ابو المعالی نصر اللہ بن محمد بن عبد الحمید نے عبد اللہ بن المقفع کی عربی تصنیف کلیلہ و دمنہ کا فارسی میں ترجمہ کیا جو دراصل سنسکرت سے عربی میں منتقل ہوئی تھی۔[۲]

---

[۱] عربی میں ابوبکر بن اسحاق کی التعرف کو تصوف کی قدیم ترین تصانیف میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ غالباً ۳۸۵ھ میں فوت ہوئے تھے۔ اب اس کتاب کا اردو ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن نے لاہور سے ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء میں شایع کیا ہے۔

[۲] حاشیہ اگلے صفحہ پر

غوری سلاطین کے عہد میں جن علمائے ہمارے ملک کو سب سے زیادہ مستفید فرمایا ان میں سرفہرست خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ (م ۶۲۷ھ/ ۱۲۳۰ء) ہیں۔ انھوں نے اور ان کے نامور خلیفہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تبلیغ سے دہلی، لاہور، اجمیر اور ملتان وغیرہ میں ہزاروں کو مسلمان بنایا۔ اسی زمانے میں نامور متکلم امام فخر الدین رازی (صاحب تفسیر کبیر) بھی تھے جو غوری بادشاہوں کے تعلق کی وجہ سے غزنین میں تھے لیکن لاہور بھی آتے ہوں گے۔ سلطان التمش کے زمانے میں مشہور محدث اور ماہر لسانیات حسن الصغانی [۲] (م ۶۵۰ھ) خلیفۂ بغداد کے سفیر کی حیثیت سے لاہور میں مقیم ہوئے۔ پھر سلطان بلبن کے زمانے میں دہلی ایک عظیم علمی مرکز بن گیا تھا، امیر خسرو نے اپنے اشعار میں اس کی بہت تعریف کی ہے۔ بابا فرید شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ (م ۶۶۴ھ/ ۱۲۶۵ء) اور ان کے مرید شیخ جمال ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۶۶۹ھ/ ۱۲۷۱ء) اور حضرت نظام الدین اولیا بدایونی ثم دہلوی (م ۷۲۵ھ/ ۱۳۲۵ء) کی دینی خدمات کبھی فراموش نہیں کی جاسکتیں۔ حضرت امیر خسرو (م ۷۲۵ھ/ ۱۳۲۵ء) جیسے باکمال اور جامع الصفات لوگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ عربی، فارسی، ترکی اور ہندی شاعری میں کمال حاصل تھا۔ پانچ دواوین فارسی میں ہیں۔ تاریخی مثنویاں اور خمسہ ان کے علاوہ ہیں۔ ان کی کتاب اعجاز خسروی میں فارسی اشعار کے ساتھ عربی اشعار بھی ہیں جن سے ان کی ایجاد کردہ صنائع لفظی اور مختلف اسالیب بیان کی وضاحت ہوتی ہے۔ اسی زمانے میں شیخ صفی الدین ہندی (م ۷۱۵ھ/ ۱۳۱۵ء) بھی تھے جو

۲۔ غزنوی عہد کی مختلف علمی اور ثقافتی یادگاروں کے لیے راقم الحروف کا مضمون The Ghaznawid heritage in Rakistan (ریسرچ سوسائٹی جرنل۔ پنجاب یونیورسٹی جنوری ۱۹۶۷ء) ملاحظہ فرمائیں۔ نیز راقم الحروف

علوم دینیہ کی تحصیل کی خاطر لاہور سے یمن اور مصر گئے تھے اور وہاں فقہ اور الکلام حاصل کیا تھا۔ تغلق سلاطین یعنی غیاث الدین تغلق اور محمد تغلق دونوں مختلف علوم و فنون کا ذوق رکھتے تھے۔ مؤخر الذکر نے مواقف کے مصنف قاضی عضد الدین کو شیراز سے دہلی بلوایا تھا لیکن وہ نہیں آسکے۔ بسلطان فیروز تغلق کے زمانے میں مولانا خواجگی، قاضی حمید الدین دہلوی، احمد تھانیسری اور عبد المقتدر وغیرہ فقہ کی خدمات میں مشہور رہیں۔ اسی بادشاہ کے ایک امیر تاتار خان کے نام پر ایک ممتاز عالم ابنِ عطاء نے الفتاویٰ التاتارخانیہ (فقہ پر) کتاب لکھی تھی۔ مشہور لغت القاموس کا مصنف مجد الدین فیروز آبادی (م۔ ۸۱۷ھ/۱۴۱۴ء) بھی اسی دور سے تعلق رکھتا ہے۔ لودھی سلاطین میں سکندر لودھی نے آگرہ کو علم و فن کا مرکز بنایا۔ اس کے زمانے میں ملتان کے ممتاز عالم اور فلسفی عبداللہ تلنبی، مشہور محدّث رفیع الدین شیرازی اور مؤخر الذکر کے شاگرد ابوالفتح تھانیسری، نیز ابوالفضائل سعد الدین دہلوی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

لاہور، ملتان، دہلی، بدایوں اور آگرہ کے علاوہ بعد میں بنگال کے دو مقام لکھنوتی اور مرشد آباد بھی اسلامی علوم کے مرکز بن گئے تھے۔ پھر لکھنؤ کے مشہور عالم مولانا عبد العلی (المعروف بحر العلوم) کی وجہ سے ضلع بردوان کا موضع بوہار بھی ایک مرکز بن گیا تھا۔ پھر جونپور، مالوہ، گجرات، خاندیش، دکن اور کشمیر بھی ایسے مراکز بن گئے تھے

کی کتاب "تاریخ بہرام شاہ غزنوی" (انگریزی) لاہور ۱۹۵۵ء ملاحظہ ہو۔

۲۔ استادی پروفیسر ضیاء احمد بدایونی مرحوم نے مباحث و مسائل (مطبوعہ دہلی ۱۹۶۸ء) کے صفحہ ۵۳ ۴ کے مضمون میں ثابت کیا ہے کہ یہ حسن بدایوں میں پیدا ہوئے تھے۔

جن میں دین کی بہت خدمت ہوئی۔

بابر اور ہمایوں کے زمانے کے علماء اور اولیاء کا ذکر طبقات شاہجہانی میں ملتا ہے۔ شیر شاہ سوری کے زمانے میں شیخ بدھن بہاری اور شیخ عبداللہ سلطان پوری مشہور عالم ہوئے ہیں۔ اکبر گو کہ ان پڑھ تھا لیکن فیضی، ابوالفضل عبدالقادر بدایونی، نور اللہ شوستری وغیرہ اسی کے دربار میں تھے۔ جہانگیر کے زمانے میں عبدالحق محدّث دہلوی رم۔ ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء) اور مجدد الفِ ثانی شیخ احمد فاروقی (م۔ ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء) اپنے علوم اور دینی خدمات کی وجہ سے بہت ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ شاہجہاں کے زمانے میں محمود جونپوری، نور الحق، عبدالحکیم سیالکوٹیؒ، عبدالرشید، عبدالباقی اور محب اللہ الہ آبادی مشہور علماء میں سے تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں شیخ نظام کے زیرِ اہتمام حنفی فقہ پر فتاوائے عالمگیری لکھی گئی جو فتاویٰ الہندیہ بھی کہلاتی ہے۔ ملّا جیون، ملّا قطب الدین سہالوی اور میر زاہد نے بھی متعدد کتابیں لکھیں۔ پھر اورنگ زیب کے بعد گو کہ سیاسی لحاظ سے ہمارا ملک ہر طرح کی افراتفری کا شکار ہو گیا لیکن بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے۔ مثلاً عبدالجلیل بلگرامی، غلام علی آزاد بلگرامی، سلام اللہ محدّث شاہ ولی اللہ محدّث، مظہر جانِ جاناں، شاہ عبدالعزیز محدث اور ان کے برادرانِ گرامی۔ فضل امام، فضل حق خیر آبادی، ثناء اللہ پانی پتی، شاہ غلام علی، شاہ احمد سعید دہلوی، شاہ عبدالغنی محدث دہلوی وغیرہ کس قدر مشاہیر ہیں جن کی دینی اور علمی خدمات خصوصی طور پر یادگار ہیں۔

ان کے بعد مولانا عبدالحی فرنگی محلی، نواب صدیق حسن خان، نواب قطب الدین خان، مولانا خرم علی بلہوری، مولانا مملوک علی نانوتوی وغیرہ اس قدر علماء اور فضلاء پیدا ہوئے کہ ان کے صرف نام گنوانے کے لیے کئی صفحات درکار ہیں۔

اب ہم مختصر طور پر پہلے عربی تصانیف کا ذکر کرتے ہیں :

عربی تفاسیر میں محمود بن عمر زمخشری رم ۔ ۵۳۸ھ/۱۱۴۴ء) کی تفسیر الکشاف اور عبداللہ بن عمر بیضاوی رم ۔ ۶۸۵ھ/ ۱۲۸۶ء) کی تفسیر بیضاوی کو خاص مقام حاصل ہے ۔ اول الذکر نحوی اور لسانی نقطۂ نظر سے لکھی گئی تھی اور موخر الذکر میں علمی تبحّر بہت ہے ۔ اس لیے اس کی بکثرت شرحیں اور حواشی لکھے گئے اور ہر زمانے میں اس سے استفادہ کیا گیا ۔ ابوبکر اسحاق ابن تاج الدین البکری الملتانی رم ۔ ۷۳۶ھ/۱۳۳۵ء) امیر کبیر سید علی ہمدانی رم ۔ ۷۸۶ھ/ ۱۳۸۴ء) علی ابن احمد المہائمی رم ۔ ۸۳۵ھ/۱۴۳۲ء) خواجہ حسین ناگوری رم ۔ ۹۰۱ھ/۱۴۹۵ء) الہ داد جونپوری رم ۔ ۹۳۲ھ/ ۱۵۲۵ء) خطیب ابو الفضل گزرونی گجراتی رم ۔ ۹۵۹ھ/ ۱۵۵۲ء) علی متقی بن حسام الدین برہان پوری رم ۔ ۹۷۵ھ/۱۵۶۷ء) وجیہ الدین علوی گجراتی رم ۔ ۹۹۸ھ/۱۵۸۹ء) ملّا مبارک ناگوری رم ۔ ۱۰۰۱ھ/۱۵۹۳ء) ابو الفیض فیضی ابن ملّا مبارک صاحبِ سواطع الالہام رم ۔ ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵ء) قاضی نور اللہ شوستری رم ۔ ۱۰۱۹ھ/ ۱۶۱۰ء) مرزا بدیع الزمان (رشید خان) صاحب بدیع المبارک رم ۔ ۱۰۳۷ھ/ ۱۶۲۸ء) عماد الدین عبد النبی شطاری رم ۔ بعد ۱۰۲۰ھ / ۱۶۱۱ء) عیسٰی جند اللہ برہان پوری رم ۔ ۱۰۳۱ھ/ ۱۶۲۲ء) ابوبکر محی الدین عبد القادر العیدروس احمد آبادی رم ۔ ۱۰۳۸ھ/۱۶۲۸ء) عبدالحق محدث دہلوی رم ۔ ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء) شیخ محب اللہ الہ آبادی رم ۔ ۱۰۵۸ھ/۱۶۴۸ء) ملّا عبدالحکیم سیالکوٹی رم ۔ ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۶ء) نور الحق ابن عبد الحق محدث دہلوی رم ۔ ۱۰۷۳ھ/ ۱۶۶۲ء) محمد علی کربلائی رم ۔ ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء)

---

۱ ۔ ڈاکٹر زبید احمد مرحوم کی کتاب The Contribution of India to the Arabic Literature میں ان تصانیف کی تفصیل ہے

گیارہویں صدی ہجری کے شیخ عبداللطیف ابن شاہ جمال النہروالی۔
اسماعیل ابن جعفر۔ جلال ابن ناصر خبانی۔ عبداللہ بن عبدالحکیم سیالکوٹی
پھر میر محمد زاہد (م۔ ۱۱۰۱ھ/۱۶۹۰ء) سید محمد ابوالمجد محبوب عالم احمد
آبادی (م۔ ۱۱۱۱ھ/۱۶۹۹ء) شیخ غلام نقشبند لکھنوی (م۔ ۱۱۲۶ھ
۱۷۱۴ء) ملا جیون احمد بن ابی سعید (م۔ ۱۱۳۰ھ/۱۷۱۷ء) امان اللہ
بنارسی (م۔ ۱۱۳۳ھ/۱۷۲۰ء)۔ علی اصغر قنوجی (م۔ ۱۱۴۰ھ/۱۷۲۷ء)
نورالدین احمد آبادی (م۔ ۱۱۵۵ھ/۱۷۴۲ء) محمد عابد لاہوری (م۔
۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء) ملا حامد جونپوری (م۔ ۱۱۷۳ھ/۱۷۵۹ء) محمد ہاشم
ٹھٹھوی (م۔ ۱۱۷۴ھ/۱۷۶۰ء) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م۔ ۱۱۷۶ھ
۱۷۶۲ء) محمد علی حزین (م۔ ۱۱۸۳ھ/۱۷۶۹ء) ابوالفیض محمد زبیدی
(م۔ ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۱ء) عبدالباسط قنوجی (م۔ ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء)
قاضی ثناء اللہ پانی پتی (م۔ ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) سلام اللہ رامپوری (م۔
۱۲۲۹ھ/۱۸۱۳ء) شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م۔ ۱۲۳۹ھ/
۱۸۲۳ء) محمد اشرف لکھنوی (م۔ ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء) سید حسین نصیر
آبادی (م۔ ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء) علیم اللہ ہندی (تیرہویں صدی) حافظ
محمد حسن پشاوری (تیرہویں صدی) ولی اللہ فرنگی محلی (م۔ ۱۲۷۰ھ/
۱۸۵۳ء) نواب صدیق حسن خان (م۔ ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء) فیض الحسن
سہارنپوری (م۔ ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء) عبدالحمید فراہی (م۔ ۱۳۴۹ھ
۱۹۳۰ء) مولانا ثناء اللہ امرتسری (م۔ ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء) اب مفتی
محمد جمیل صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب وغیرہ نے مختلف زاویہ ہائے
نگاہ سے قرآن پاک کا مطالعہ کر کے عربی تفسیریں لکھی ہیں۔

تجوید و قراءات کے فن پر ہمارے یہاں عربی میں پہلے بہت کم
کتابیں لکھی گئیں۔

۱۔ Princeton University Catalogue لندن ۱۹۳۸ء صفحہ ۲۱۵۔

کہا جاتا ہے کہ مولانا عبدالقدوس گنگوہی (م - ۹۴۴ھ/۱۵۳۷ء) نے تجوید پر فوائد القرآت کتاب لکھی تھی لیکن وہ ناپید ہے[1] اور یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کس زبان میں تھی۔ پھر شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م - ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء) نے الدرۃ الفریدہ لکھی۔ موجودہ صدی میں قاری ضیاء الدین احمد الہ آبادی (م - ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۲ء) نے عربی میں خلاصۃ البیان لکھی تھی اور ان کے معاصر قاری محمد صدیق خراسانی نے جو ہندوستان میں مستقل طور پر قیام پذیر تھے۔ روح التجوید اور زبدۃ ترتیل القرآن لکھیں۔ قاری ضیاء الدین احمد کے شاگردوں میں سے قاری محمد صدیق بنگالی نے شاطبیہ کی شرح عربی میں لکھی اور قاری محمد نذر لکھنوی نے نظم القرآن فی رسم القرآن لکھی جس میں اردو ترجمہ بھی شامل ہے۔ ان کے ایک اور شاگرد قاری محمد اظہر عرف ابرار احمد امروہوی نے اشعۃ الضیاء لکھی جس کے مباحث اردو میں ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی (م - ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) نے وجوہ المثانی میں قراءات سبعہ کی تفصیل دی ہے اور تنشیط الطبع فی اجراء السبع میں قراءت کی ہر روایت کے قواعد بتا کر قراءات کو جمعاً پڑھنے کی ترکیب بتائی ہے اور اس کا اجراء کرایا ہے۔ مولانا کی یہ دونوں کتابیں اس فن میں بہت وقیع ہیں۔

علوم حدیث میں جن علماء نے عربی میں کام کیا ہے ان میں سے چند یہ ہیں:
رضی الدین حسن بن محمد صغانی (م - ۶۵۰ھ/۱۲۵۲ء) ابو حفص سراج الدین عمر بن اسحاق (م - ۷۷۳ھ/۱۳۷۱ء) امیر کبیر سید علی ہمدانی (م - ۷۸۶ھ

۱- مولانا اعجاز الحق قدوسی نے (جو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سے ہیں) اپنی کتاب "شیخ عبدالقدوس گنگوہی" (کراچی ۱۹۶۱ء صفحہ ۲۲۳ بعد) میں بھی اس کتاب کے متعلق کوئی ایسی وضاحت نہیں کی۔

۱۳۸۴ء) بدرالدین محمد بن ابی بکر (۸۲۷ھ/۱۴۲۴ء) سید عبدالاول
زید پوری (م - ۹۶۸ھ/۱۵۶۰ء) علی متقی بن حسام الدین برہان پوری
(م - ۹۷۵ھ/۱۵۶۷ء) شیخ جمال الدین محمد بن طاہر پٹنی (م - ۹۸۶ھ/
۱۵۷۸ء) زین الدین بن عبدالعزیز معبری (م - ۹۹۱ھ/۱۵۸۳ء)
وجیہ الدین گجراتی (۹۹۸ھ/۱۵۸۹ء) محمد ابو الطیب سندھی (دسویں
صدی) سعید بن محمد المفتی (م - ۱۰۱۵ھ/۱۶۰۶ء) نوراللہ شوستری
(م - ۱۰۱۹ھ/۱۶۱۰ء) عماد الدین محمد عارف شطاری (م - ۱۰۲۰ھ
۱۶۱۱ء کے بعد) الحسن بن علی المدنی (م - ۱۰۴۶ھ/۱۶۳۶ء)
عبدالحق محدث دہلوی (۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء) نورالحق بن عبدالحق محدث دہلوی
(م - ۱۰۷۳ھ/۱۶۶۲ء) سید محمد ابو المجد محبوب عالم احمد آبادی (م -
۱۱۱۱ھ/۱۶۹۹ء) ملا تقی بن شاہ محمد لاہوری (م - ۱۱۳۱ کے قریب)
ابو الحسن بن عبدالہادی سندھی (م - ۱۱۳۸ھ/۱۷۲۵ء) نورالدین
احمد آبادی (م - ۱۱۵۵ھ/۱۷۴۲ء) محمد حیات سندھی (۱۱۶۳ھ/
۱۷۴۹ء) محمد ہاشم ٹھٹھوی (م - ۱۱۷۴ھ/۱۷۶۰ء) شاہ ولی اللہ
محدث دہلوی (م - ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) شیخ عبدالعزیز بن شیخ ولی
گجراتی (بارہویں صدی) غلام علی آزاد بلگرامی (م - ۱۲۰۰ھ/
۱۷۸۵ء) ابو الفیض محمد زبیدی (م - ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۱ء) عبدالباسط
قنوجی (م - ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء) سلام اللہ رام پوری (م - ۱۲۲۹ھ
۱۸۱۳ء) عبدالعلی (بحرالعلوم) لکھنوی (م - ۱۲۳۵ھ/۱۸۱۹ء)
شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م - ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۳ء) شاہ محمد
اسماعیل ابن عبدالغنی ابن شاہ ولی اللہ دہلوی (م - ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء)
ارتضا خان گوپاموی (م - ۱۲۵۱ھ/۱۸۳۵ء) سید ابو احمد اولاد
حسن قنوجی (م - ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء) محمد عابد سندھی (م - ۱۲۵۷ھ

۱۸۴۱ء) حافظ دراز پشاوری، شارح بخاری رم - ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء)
فضل حق خیرآبادی رم - ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء) فضل رسول بدایونی رم -
۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء) کرامت علی جونپوری رم - ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء)
شاہ عبدالغنی مجددی رم - ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۸ء) مولانا احمد علی محدث
سہارنپوری رم - ۱۲۹۷ھ/۱۸۷۹ء) نواب صدیق حسن خان رم -
۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء) فیض الحسن سہارنپوری رم - ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء)
ارشاد حسین رامپوری رم - ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء) فاروق چڑیاکوٹی
رم - ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء) شمس الحق عظیم آبادی، شارح ابوداؤد رم -
۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء) مفتی لطف اللہ علی گڑھی رم - ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۶ء)
مولانا اوسط حسین مخدوم پوری رم - ۱۳۳۷ھ/۱۹۱۸ء) شیخ الہند
محمود حسن رم - ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء) مولانا احمد رضا خان بریلوی رم -
۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) حکیم عبدالحئی لکھنوی رم - ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۳ء)
حکیم برکات احمد ٹونکی رم - ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۸ء) عبدالحمید فراہی رم -
۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء) مولانا انور شاہ کشمیری رم - ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۳ء)
شاہ سلیمان پھلواروی رم - ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۵ء) مولانا سلیمان اشرف
رم - ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء) مولانا عبدالعزیز گوجرانوالہ، صاحب اطراف
البخاری رم - ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء) مولانا حیدر حسن ٹونکی رم - ۱۳۶۱ھ/
۱۹۴۲ء) مولانا اشرف علی تھانوی (۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) مولانا عبدالرؤف
داناپوری رم - ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۷ء) مولانا ثناء اللہ امرتسری رم -
۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء) مولانا شبیر احمد عثمانی رم - ۱۳۶۹ھ/۱۹۴۹ء)
مفتی کفایت اللہ دہلوی رم - ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء) مولانا سلیمان ندوی
رم - ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء) مولانا حسین احمد مدنی رم - ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء)
مولانا احمد علی لاہوری رم - ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۲ء) مولانا نصیر الدین غورغشتوی

(م - ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰ء) مفتی محمد شفیع (م - ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء) مولانا
محمد یوسف بنوری[1] وغیرہ علماء نے حدیث اور اس کے علوم پر عربی میں
کام کیا ہے۔

علوم فقہ پر بھی عربی میں بہت کام ہوا ہے۔ چند مصنفین یہ ہیں۔
محمد بن اسماعیل الخطیب دہلوی (م - ۶۴۰ھ/۱۲۴۲ء) صفی الدین
(م - ۷۱۵ھ/۱۳۱۵ء) قاضی حمید الدین دہلوی (م - ۷۶۴ھ/۱۳۶۲ء)
ابو حفص سراج الدین عمر بن اسحاق (م - ۷۷۳ھ/۱۳۷۱ء) سید یوسف
بن جمال ملتانی (م - ۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء) شیخ علی بن احمد مہائمی (م -
۸۳۵ھ/۱۴۳۲ء) شہاب الدین بن شمس الدین عمر دولت آبادی
(م - ۸۴۹ھ/۱۴۴۵ء) سعد الدین خیرآبادی (م - ۸۸۲ھ/
۱۴۷۷ء) سعد الدین بن عبد اللہ بن عبد الکریم (م - ۸۹۱ھ/
۱۴۸۶ء) قاضی حکن گجراتی (م - ۹۲۰ھ/۱۵۱۴ء) اللہ داد جونپوری
(م - ۹۳۲ھ/۱۵۲۵ء) عبد الاول زید پوری (م - ۹۶۸ھ/۱۵۶۰ء)
شیخ جلال تھانیسری (م - ۹۸۹ھ/۱۵۸۱ء) مخدوم الملک عبد اللہ
سلطان پوری (م - ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء) رحمت اللہ بن عبد اللہ سندھی
(م - ۹۹۳ھ/۱۵۸۵ء) وجیہ الدین گجراتی (م - ۹۹۸ھ/۱۵۸۹ء)
شیخ حامد بن عبد اللہ سندھی (م - ۱۰۰۹ھ/۱۶۰۰ء) عبد الحکیم سیالکوٹی
(م - ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۶ء) عبد الرشید جونپوری (م - ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء)
معین الدین نقشبندی (م - ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء) شیخ نظام اور
دوسرے علماء (فتاویٰ عالمگیری کے مرتبین)۔ قاضی محب اللہ بہاری
(م - ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء) ملا محمد حسن کشمیری (م - ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء)

---

[1] افسوس کہ مولانا محمد یوسف بنوری صاحب نے دوشنبہ ۳ ذی قعدہ ۱۳۹۷ھ
(۱۷ اکتوبر) کو انتقال کیا۔

ملا جیون رم ۔ ۱۱۳۰ھ/ ۱۷۱۷ء) محمد حافظ امان اللہ بنارسی رم ۔ ۱۱۳۳ھ
/۱۷۲۰ء) ۔ بہار الدین محمد بن تاج الدین حسن اصفہانی رم ۔ ۱۱۳۷ھ/
۱۷۲۴ء) حبیب اللہ قنوجی رم ۔ ۱۱۴۰ھ/ ۱۷۲۷ء) عنایت اللہ
قادری لاہوری رم ۔ ۱۱۴۱ھ/ ۱۷۲۸ء) شاہ خوب اللہ الٰہ آبادی
رم ۔ ۱۱۴۴ھ/ ۱۷۳۱ء) عبد النبی احمد نگری رم ۔ ۱۱۴۴ھ/ ۱۷۳۱ء)
نور الدین احمد آبادی (۱۱۵۵ھ/ ۱۷۴۲ء) حمد اللہ سندیلوی رم ۔
۱۱۶۰ھ/ ۱۷۴۷ء) ملا نظام الدین فرنگی محلی رم ۔ ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء)
محمد ہاشم ٹھٹھوی رم ۔ ۱۱۷۴ھ/ ۱۷۶۰ء) شاہ ولی اللہ دہلوی رم ۔
۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۲ء) رستم علی قنوجی رم ۔ ۱۱۷۸ھ/ ۱۷۶۴ء) ملا نور محمد
کشمیری رم ۔ ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۰ء) ابو الفیض محمد زبیدی رم ۔ ۱۲۰۵ھ/
۱۷۹۱ء) ملا محمد حسن لکھنوی رم ۔ ۱۲۰۹ھ/ ۱۷۹۴ء) عبد الباسط
قنوجی رم ۔ ۱۲۲۳ھ/ ۱۸۰۸ء) ملا محمد مبین رم ۔ ۱۲۲۵ھ/
۱۸۱۰ء) سید دلدار علی مجتہد رم ۔ ۱۲۳۵ھ/ ۱۸۱۹ء) عبد العلی
(بحر العلوم) لکھنوی رم ۔ ۱۲۳۵ھ/ ۱۸۱۹ء) الٰہی بخش کاندھلوی
رم ۔ ۱۲۴۵ھ/ ۱۸۲۹ء) عبد الواحد سہوانی رم ۔ ۱۲۴۵ھ/ ۱۸۲۹ء)
شاہ اسماعیل دہلوی رم ۔ ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) مفتی ولی اللہ فرخ آبادی
رم ۔ ۱۲۴۹ھ/ ۱۸۳۳ء) شاہ ابو سعید دہلوی رم ۔ ۱۲۵۰ھ/
۱۸۳۴ء) اولاد حسین قنوجی رم ۔ ۱۲۵۳ھ/ ۱۸۳۷ء) امین اللہ
رم ۔ ۱۲۵۳ھ/ ۱۸۳۷ء) محمد عابد سندھی رم ۔ ۱۲۵۷ھ/ ۱۸۴۱ء)
شاہ محمد اسحاق دہلوی رم ۔ ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۶ء) مولانا مملوک علی
نانوتوی رم ۔ ۱۲۶۷ھ/ ۱۸۵۱ء) ملا نور الدین رام پوری رم ۔ ۱۲۷۰ھ
/۱۸۵۳ء) ولی اللہ بن حبیب اللہ لکھنوی رم ۔ ۱۲۷۰ھ/ ۱۸۵۳ء)
خادم علی فرنگی محلی رم ۔ ۱۲۷۱ھ/ ۱۸۵۴ء) مخصوص اللہ رم ۔ ۱۲۷۳ھ

۱۸۵۶ء) فضل حق خیرآبادی (رم - ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء) مفتی عنایت
احمد کاکوروی (رم - ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۲ء) مفتی صدرالدین آزردہ (رم -
۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء) فضل رسول بدایونی (رم - ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء)
کرامت علی جونپوری (رم - ۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۳ء) امیر حسن سہسوانی (رم -
۱۲۹۱ھ/ ۱۸۷۴ء) مولانا احمد علی محدث سہارنپوری (رم - ۱۲۹۷ھ/
۱۸۷۹ء) مولانا محمد قاسم نانوتوی (رم - ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۷۹ء) نواب
صدیق حسن خان بھوپالی (رم - ۱۳۰۷ھ/ ۱۸۹۰ء) فیض الحسن سہارنپوری
(رم - ۱۳۰۸ھ/ ۱۸۹۰ء) رحمت اللہ کیرانوی (رم - ۱۳۰۸ھ/ ۱۸۹۱ء)
ارشاد حسین رامپوری (رم - ۱۳۱۱ھ/ ۱۸۹۳ء) عنایت رسول چریا
کوٹی (رم - ۱۳۲۰ھ/ ۱۹۰۲ء) میاں نذیر حسین دہلوی (رم - ۱۳۲۰ھ/
۱۹۰۲ء) مولانا رشید احمد گنگوہی (رم - ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۵ء) مولانا
رحمان علی (رم - ۱۳۲۵ھ/ ۱۹۰۷ء) مولانا فاروق چریاکوٹی (رم - ۱۳۲۷ھ/
۱۹۰۹ء) شمس الحق عظیم آبادی (رم - ۱۳۲۹ھ/ ۱۹۱۱ء) حاجی عابد
حسین بانی دیوبند (رم - ۱۳۳۰ھ/ ۱۹۱۲ء) مولانا شبلی نعمانی، صاحب
اسکات المعتدی (رم - ۱۳۳۲ھ/ ۱۹۱۴ء) مفتی لطف اللہ علی گڑھی
(رم - ۱۳۳۵ھ/ ۱۹۱۶ء) مولانا عبدالغفور شکارپوری (رم - ۱۳۳۶ھ/
۱۹۱۸ء) مفتی محمد معالالی سندھی (رم - ۱۳۳۶ھ/ ۱۹۱۸ء) مولانا
اوسط علی مخدوم پوری (رم - ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۸ء) شیخ الہند محمود حسن
(رم - ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۰ء) مولانا احمد رضا خان بریلوی (رم - ۱۳۴۰ھ/
۱۹۲۱ء) حکیم عبدالحئی لکھنوی (رم - ۱۳۴۱ھ/ ۱۹۲۳ء) حکیم برکات
احمد ٹونکی (رم - ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸ء) عبدالحمید فراہی (رم - ۱۳۴۹ھ/
۱۹۳۰ء) قاضی سلیمان منصورپوری (رم - ۱۳۴۹ھ/ ۱۹۳۰ء)
مولانا انورشاہ کشمیری (رم - ۱۳۵۱ھ/ ۱۹۳۳ء) مولانا عبدالعزیز

گوجرانوالہ رم۔ ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء) مولانا حیدر حسن ٹونکی رم۔ ۱۳۶۱ھ/۱۹۴۲ء) مولانا اشرف علی تھانوی رم۔ ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) مولانا عبدالرؤف داناپوری رم۔ ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۷ء) مولانا ثناء اللہ امرتسری رم۔ ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء) مولانا شبیر احمد عثمانی رم۔ ۱۳۶۹ھ/۱۹۴۹ء) مفتی کفایت اللہ دہلوی رم۔ ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء) مولانا حسین احمد مدنی رم۔ ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء) مولانا احمد علی لاہوری رم۔ ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۲ء) مولانا مفتی محمد شفیع رم۔ ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء)

ان کے علاوہ بھی بکثرت علماء ہیں جنہوں نے تفسیر، حدیث اور فقہ وغیرہ پر مستقل تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ متاخرین میں مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ رم۔ ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) جیسے علماء سرمایۂ ناز ہیں۔ ان کی چند کتابیں یہ ہیں۔

(۱) التعلیق الصبیح علی مشکوٰۃ المصابیح۔ ۲۰ جلدیں۔ (۲) تحفۃ القاری علی صحیح البخاری۔ ۳ جلدیں۔ (۳) شرح بیضاوی۔ ۱۳ جلدیں۔ (۴) مقدمۃ الحدیث۔ ۳ جلدیں۔ (۵) مقدمۃ الفیۃ الحدیث۔

مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی رم۔ ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء) کی کتابوں میں اعلاء السنن۔ ۳۰ جلدیں اور "مناقب امام ابی حنیفہ" خصوصیت رکھتی ہیں۔ مفتی احمد یار خان کی "نعیم الباری شرح بخاری" مولانا شبیر احمد عثمانی کی "فتح الملہم شرح مسلم" مولانا عبداللہ روپڑی کی "الکتاب المستطاب"۔ مولانا احسان الٰہی ظہیر کی "الشیعہ والسنیہ والقادیانیہ" مولانا عبدالکریم قادری کی "حاشیہ مرقات۔ مولانا محمد چراغ کی "العرف الشذی" مولانا عبدالرشید نعمانی کی "مقدمہ ابن ماجہ ما تمس بہ الحاجہ"۔ مولانا عطاء اللہ حنیف کی "التعلیقات السلفیہ علی سنن النسائی"۔ مولانا غلام رسول کی "حاشیہ مسلم الثبوت" مولانا غلام علی

اوکاڑوی کی "مقدمہ تفسیر بیضاوی"۔ مولانا محمد موسیٰ خان کی "(۱) لغۃ الکامل الحسامی" (۲) حاشیۃ الحاصل والمحصول"۔ (۳) شرح قصیدۂ بردہ" مولانا محمد یوسف بنوری کی (۱) "بغیۃ الاریب" (۲) "نفحۃ العنبر" (۳) "معارف السنن" مفتی محمد جمیل کی "(۱) احکام القرآن"۔ (۲) "تفسیر یونس الی بنی اسرائیل"۔ مولانا نور اللہ کی "تنویر فی الزمان"۔

تفسیر، حدیث، اور فقہ کے ذیل میں پاک و ہند[۱] کے درس (ملا عبدالحکیم سیالکوٹی) اور درسِ ملا نظام الدین میں دوسرے علوم بھی پڑھائے جانے لگے۔ یعنی اصولِ تفسیر، اصولِ حدیث، اصولِ فقہ، صرف، نحو، معانی و بیان، عروض، منطق، فلسفہ، ادب عربی، علم الکلام، تاریخ و سیرت، طب، ہیئت، ہندسہ، مناظرہ وغیرہ[۲] پھر خطبات، فتاویٰ شروح، لغات وغیرہ کا ذخیرہ بھی جمع ہو گیا۔

شاعری میں بھی ہمارے علماء اور فضلاء نے حصّہ لیا ہے۔ دوسری صدی ہجری کے محمد ابن السندی مکی۔ ابو عطا السندی اور سندی بن صدقہ کے عربی کلام کے نمونے ملتے ہیں۔ پھر تیسری ہجری کے عربی شعراء میں ہارون

---

[۱] ڈاکٹر صابر آفاقی نے "عربی کے کشمیری مؤلفین" پر مضمون رسالہ بینات (کراچی شعبان ۱۳۹۴ھ) میں شائع کیا ہے۔ مختلف علاقوں کی عربی خدمات کے متعلق مضامین "پاکستان میں فروغ عربی" (کراچی ۱۹۷۵ء) میں ملاحظہ فرمائیں۔

[۲] حافظ نذر احمد نے بڑی تفصیل سے عربی مدارس کے علوم، مراکز، اخراجات، تصنیفات وغیرہ کے متعلق جائزے ۱۹۶۰ء، ۱۹۷۳ء اور ۱۹۷۵ء میں شائع کیے ہیں۔ مولانا سلیمان ندوی نے "حیات شبلی" (اعظم گڑھ ۱۹۴۳ء) کے ابتدائی ۵۷ صفحات میں برصغیر کے مختلف ادوار کے مدارس اور علماء کی تفصیل دی ہے۔

بن موسیٰ ملتانی ۔ محمد بن زیاد بن الاعرابی ۔ ابو الصلع سندی اور کشاجم
بن الحسن کو خصوصیت حاصل ہے ۔ حسن بن حامد دیبلی (م ۔ ۴۰۷ھ/
۱۰۱۶ء) اور حسن بن علی الداوری (م ۔ ۴۴۵ھ/۱۰۵۳ء) بغداد میں
بھی شہرت رکھتے تھے ۔ فارسی کے مشہور شاعر مسعود سعد سلمان لاہوری
(م ۔ ۵۱۵ھ/۱۱۲۱ء) کی عربی شاعری کا ذکر محمد عوفی کی "لباب الالباب"
میں ملتا ہے ۔ حسن بن محمد صغانی (م ۔ ۶۵۰ھ/۱۲۵۲ء) احمد تھانیسری
(نویں صدی) ۔ محمد بن عبد العزیز کالی کوٹی (دسویں صدی) ۔ شیخ فضیل
بن شیخ جلال واصل کالپوی (دسویں صدی) شاہ عبد الرحیم دہلوی
(م ۔ ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۸ء) عبد المجید سندھی (بارہویں صدی) سید
عبد الجلیل بلگرامی (م ۔ ۱۱۳۸ھ/۱۷۲۵ء) علی بن اصغر عبد الصمد قنوجی
(م ۔ ۱۱۴۰ھ/۱۷۲۷ء) حبیب عبد اللہ (بارہویں صدی) شاہ
ولی اللہ دہلوی (م ۔ ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) ابو الحسن داہری نقشبندی
(م ۔ ۱۱۸۱ھ/۱۷۶۷ء) محمد باقر آگاہ (م ۔ ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء)
محمد غوث شرف الملک بن نظام الدین احمد (م ۔ ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۲ء)
شاہ عبد العزیز محدث دہلوی (م ۔ ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء) شاہ رفیع الدین
(م ۔ ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء) محمد سلیم (م ۔ ۱۲۶۶ھ/۱۸۴۹ء) فیض
احمد بن غلام احمد بدایونی (م ۔ ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۷ء) رضا حسن خان
کاکوری (تیرھویں صدی) محمد فضل حق بن فضل امام خیر آبادی (م ۔
۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء) حافظ غلام حسین رام پوری (تیرھویں صدی) حا
غلام محمد ہالائی سندی (م ۔ ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء) احمد بن عبد العلیم
سندی (م ۔ ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء) نواب صدیق حسن خان (م ۔
۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء) مولانا ارشاد حسین (م ۔ ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء)
امیر علی سہار (م ۔ ۱۳۱۳ھ/ ۔ ڈپٹی نذیر احمد دہلوی (م ۔ ۱۳۳۰ھ/

۱۹۱۲ء) مولانا شبلی نعمانی (م - ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء) مولانا حالی
(م - ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۴ء) مولانا احمد رضا خان (م - ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء)
حکیم عبدالحی لکھنوی (م - ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۳ء) مولانا اشرف علی تھانوی
(م - ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) مولانا ظفر احمد تھانوی (م - ۱۳۹۵ھ/
۱۹۷۵ء) مفتی محمد شفیع[1] (م - ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء) مولانا محمد یوسف
بنوری (م - ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء) وغیرہ وغیرہ بکثرت علماء نے اپنی
عربی شاعری کی کوئی نہ کوئی صنف یادگار چھوڑی ہے۔

مرصع عربی نثر کے نمونے ان فضلاء کے خاص ہیں۔
حضرت نظام الدین اولیاءؒ (م - ۷۲۵ھ/۱۳۲۴ء) قاضی
شہاب الدین بن شمس الدین دولت آبادی (م - ۸۴۹ھ/۱۴۴۵ء)
الہ داد لکھنوی (دسویں صدی) ابوالفیض فیضی (م - ۱۰۰۴ھ/
۱۵۹۵ء) عماد الدین محمد عارف عثمانی (م - ۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء)
حضرت شیخ احمد فاروقی سرہندی (م - ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء) عبدالقادر
العیدروس احمد آبادی (م - ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۵ء) عبداللہ لاہوری
(م - ۱۱۲۲ھ/۱۷۱۵ء) سید ابوبکر بن محسن علوی (بارہویں صدی)
سید عبدالجلیل بلگرامی (م - ۱۱۳۸ھ/۱۷۲۵ء) محمد عابد لاہوری (م -
۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء) شاہ ولی اللہ دہلوی (م - ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء)
سید محمد بلگرامی (م ۱۱۸۵ھ/۱۷۷۱ء) سید غلام علی آزاد بلگرامی (م - ۱۲۰۰ھ/

---

[1] رسالہ بینات (کراچی۔ جون ۱۹۷۷ء) میں مفتی صاحب کی عربی شاعری کے نمونے درج ہیں۔

اسی رسالے میں (بابت ستمبر ۱۹۷۴ء) مولانا ظفر احمد تھانوی اور مولانا محمد یوسف بنوری کے لکھے ہوئے عربی مرثیے ملتے ہیں۔

۱۷۸۶ء) قاضی ثناء اللہ پانی پتی (م ۔ ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء) غلام غوث شرف الملک (م ۔ ۱۲۳۸ھ / ۱۸۲۲ء) محمد باقر آگاہ (م ۔ ۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵ء) شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء) رشیدالدین خان دہلوی (م ۔ ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۳ء) احمد بن محمد یمنی شروانی (م ۔ ۱۲۵۶ھ / ۱۸۴۰ء) محمد لطیف (م ۔ ۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۰ء) رضا حسن خان کاکوری (م ۔ ۱۲۶۴ھ / ۱۸۴۸ء) محمد حسین خان شاہجہان پوری (م ۔ ۱۲۸۶ھ / ۱۸۵۹ء) مولانا احمد علی محدث سہارنپوری (م ۔ ۱۲۹۷ھ / ۱۸۷۹ء) نواب صدیق حسن خان (م ۔ ۱۳۰۷ھ / ۱۸۹۰ء) مولانا رشید احمد گنگوہی (م ۔ ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۵ء) مولانا محمد فاروق چڑیاکوٹی (م ۔ ۱۳۲۷ھ / ۱۹۰۹ء) شیخ الہند محمود حسن (م ۔ ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء) مولانا احمد رضا خان (م ۔ ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء) حکیم عبدالحئی لکھنوی (م ۔ ۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۳ء) عبدالحمید فراہی (م ۔ ۱۳۴۹ھ / ۱۹۳۰ء) مولانا انور شاہ کشمیری (م ۔ ۱۳۵۱ھ / ۱۹۳۳ء) مولانا حبیب الرحمن (م ۔ ۱۳۶۱ھ / ۱۹۴۲ء) مولانا شبیر احمد عثمانی (م ۔ ۱۳۶۹ھ / ۱۹۴۹ء) مولانا محمد یوسف بنوری (م ۔ ۱۳۹۷ھ / ۱۹۷۷ء) وغیرہ وغیرہ ۔

(ب) فارسی علم و ادب :

فارسی میں بھی دینی کتابیں شروع ہی سے ملتی ہیں اور بڑی کثیر تعداد میں ہیں ۔ یہاں اجمالاً عرض کیا جاتا ہے کہ قرآن پاک کا اولین "فارسی ترجمہ" (اور تفسیر) منصور بن نوح سامانی (ر ۲۶۵ھ / ۸۸۹ء تا ۳۵۰ھ / ۹۶۱ء) کے عہد کا دستیاب ہوا ہے[1] اس کے بعد ہر عہد میں اس کے نمونے پائے جانے لگے ۔ ایک ترجمہ حضرت شیخ سعدی شیرازی (م ۔ ۶۹۱ھ / ۱۲۹۲ء) سے منسوب ہے ۔ لیکن وہ در اصل علی بن محمد یعنی سید شریف جرجانی (م ۔ ۸۱۶ھ / ۱۴۱۳ء)

---

[1] یہ ترجمہ (چند سال پہلے) تہران سے شایع ہو چکا ہے ۔

کا ہے اور برصغیر میں غالباً سب سے پہلا فارسی ترجمہ مخدوم نوح ہالائی سندھی[1] (م ۔ ۹۹۸ھ/۱۵۹۰ء) کا ہے اور ان کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م ۔ ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) کا ہے ۔ (لیکن ان بزرگوں سے پہلے شہاب شمس دولت آبادی (م ۔ ۸۴۹ھ/۱۴۴۵ء) کی تفسیر "بحرِ مواج"[2] ہے جو غالباً ابھی تک شائع نہیں ہوئی) تیرھویں صدی ہجری میں بہار الدین محمود نے سورۃ والضحیٰ کی فارسی تفسیر لکھی تھی ۔

برصغیر میں احادیث کے متعلق بھی بہت سی فارسی کتابیں شایع ہوئی ہیں۔ تاج الدین محمد بن محمد ابراہیم نے نویں صدی ہجری تین ہزار احادیث کا ایک مجموعہ "بحر السعادۃ" کے نام سے مرتب کیا تھا ۔ (۹۹۶ھ / ۱۵۵۷ء) میں حاجی محمد کشمیری نے "شرح حصن حصین" لکھی تھی ۔ شیخ ولی الدین ابو عبداللہ محمد تبریزی نے آٹھویں صدی ہجری میں احادیث کا انتخاب "مشکوٰۃ المصابیح" کے نام سے کیا تھا ۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م ۔ ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء) نے اس کی فارسی شرح "اشعۃ اللمعات" مرتب کی ۔ انھوں نے "شرح سفر السعادۃ" اور "دستور فائض النّور" بھی احادیث سے متعلق لکھیں اور

---

[1] راقم الحروف نے مخدوم نوح رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمے کا پہلا پارہ ۱۹۶۲ء میں حیدرآباد سے شایع کیا تھا ۔ اس کے مقدمے میں مختلف ترجموں کا ذکر ہے ۔ اب مخدوم نوح رحمۃ اللہ علیہ کا مکمل ترجمہ سندھی ادبی بورڈ نے شایع کرنے کا اہتمام کیا ہے ۔ دیکھیے یہ خواب کب تک شرمندۂ تعبیر ہوتا ہے ۔

[2] ڈاکٹر ایتھے (انڈیا آفس کیٹلاگ ۔ جلد اول صفحہ ۱۴۵۸) ۔ ڈاکٹر ایتھے نے (صفحہ ۱۴۵۶ ب) ایک اور قرآنی ترجمہ کیا ہے جس پر بہت بعد کی ایک مہر ۱۱۸۸ھ / [illegible]ء) کی ملتی ہے ۔ صفحہ ۱۴۶۶ میں بھی میر جملہ بہادر ترخان کی ایک نامکمل تفسیر کا ذکر ہے ۔

ان کے صاحبزادے نورالحق نے "تفسیر القاری فی شرح صحیح البخاری" لکھی۔ خو(٦)
خان قادری نے "مخازن المعروف" کے نام سے احادیث کا مجموعہ اور ان
کا ترجمہ (١١١٦ھ / ١٧٠٤ء) میں لکھا اور غالباً اسی زمانے میں محمد بن محمود نے
"لباب الاخبار" نام کا مجموعہ فارسی میں مرتب کیا جو دراصل احمد بن عبداللہ
کے مرتب کے ہوئے انتخاب کا توضیحی اور سلیس ترجمہ ہے۔ محمد بن باقر بن محمد تقی
مجلسی (م۔ ١١١١ھ / ١٦٩٩ء) نے بھی "عین الحیٰوۃ" کے نام سے اور "امامیہ"
نقطۂ نظر سے احادیث کا (فارسی میں) ضخیم انتخاب کیا تھا۔ "حلیۃ المتقین" بھی
انھی کا دوسرا مجموعہ ہے۔[1]

"فقہ" پر بھی فارسی میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ "مجموع سلطانی" کے
متعلق کہا جاتا ہے کہ "سلطان محمود غزنوی" (٤٢١ھ / ١٠٣٠ء) کی فرمائش پر
اس کے عہد کے علماء اور فضلاء نے جو فقہی مسائل بیان کیے تھے۔ ان کا یہ مجموعہ
ہے۔ شرف الدین بخاری (م۔ ٧٠٣ھ / ١٣٠٣ء) نے "مقدمۃ الصلوٰۃ" نامی
ایک منظوم فقہی رسالہ لکھا۔ یوسف گدا نے بھی (٧٥٢ھ / ١٣٥١ء) ایک منظوم
رسالہ "تحفۃ النصائح" لکھا اور اسی زمانے میں حضرت نصیر الدین چراغ
دہلوی (م۔ ٧٥٧ھ / ١٣٥٦ء)۔ کے مرید محمد مجیر بن وجیہ الدین نے وضو،
غسل اور نماز وغیرہ کے مسائل پر ایک مجموعہ "مفتاح الجنان" لکھا، پھر
ان کے بیٹے عبدالعزیز بن مجیر نے "فتاویٰ خسروی" لکھا۔ فیروز شاہ تغلق
(م۔ ٧٩٠ھ / ١٣٨٨ء) کے عہد میں ضیاء برنی نے "فتاویٰ جہانداری"
اور ایک نامعلوم مؤلف نے "فقہ فیروز شاہی" لکھا۔ اسی زمانے میں
"شرف بن محمد" نے "فوائد فیروز شاہی" (فقہ تصوف) لکھی۔ "کمال کریم"

---

[1] ڈاکٹر ایتھے کے اسی کیٹلاگ، کے صفحات ١٤٣١ - ١٤٥٣ میں ان فارسی
مجموعوں کی تفصیل ہے۔

ناگوری نے (۱۰۰۰ھ/۱۵۹۲ء) کے قریب "مجموعۂ خانی" لکھا۔ "میاں
قادری" (م۔ ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء) کی "مفتاح الہدایہ" میں بعض فقہی مسائل
کی تشریح آتی ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م۔ ۱۰۵۲ھ/ ۱۶۴۲ء)
کی "تکمیل الایمان" محمد عابد کی (منظوم) "اساس الاسلام" اور اسی
زمانے میں "عبدالحق سجاول سرہندی" کا ترجمہ "شرح وقایہ و شرح ہدایہ"
اور ابوبکر بن محمد لاہوری کا "رسالہ غسل و جنازہ" بھی مرتب ہوا۔
محمد وارث تغلق آبادی کی "سبحنجل المسلمین" (۱۱۱۲ھ/۱۷۰۱ء) اور
کسی نامعلوم عالم کی "سلاح العابدین" (۱۱۵۰ھ/۱۷۳۷ء) بھی فقہ پر ہیں۔
"غلام یحییٰ" اور ان کے رفقاء کی "ہدایۂ فارسی" (۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء) اہم
کتاب ہے۔ سلطان ٹیپو شہید (۱۲۱۳ھ/ ۱۷۹۹ء) کے عہد کی "فتوائے محمدی"
"مفرح القلوب"، "فخر الشیوخ" وغیرہ اب بھی محفوظ ہیں اور ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔[1]
اس عہد کے بعد فارسی میں "فقہ" کی کتابیں شاذ و نادر ہی لکھی گئیں کیونکہ
اردو کو قبول عام حاصل ہو گیا۔

برصغیر کی تاریخ پر فارسی میں بکثرت کتابیں ہیں چند نام گنوائے جا سکتے ہیں۔
تاریخ "فیروز شاہی" (ضیاء الدین برنی)۔ تواریخ "فیروز شاہی"
(شمس سراج عفیف)۔ "تاج المآثر" (حسن نظامی)۔ "مطلع السعدین"۔
(عبدالرزاق سمرقندی)۔ "قران السعدین"، (منظوم)، (امیر خسرو) "واقعات
بابری" (فارسی ترجمہ)۔ "تذکرۃ الواقعات" (جوہر)۔ "تاریخ ہمایوں" (بایزید)
"منتخب التواریخ" (عبدالقادر بدایونی)۔ "آئین اکبری" (ابو الفضل) "تاریخ
فرشتہ" (محمد قاسم ہندو شاہ) "طبقات اکبری" (ملا نظام الدین) "توزک جہانگیری"

---

[1] ڈاکٹر ایتھے سے کیٹلاگ کے علاوہ محمد اسحٰق بھٹی کی کتاب "فقہائے ہند" کے مختلف
حصوں میں بکثرت فقہی کتابوں کا ذکر ہے۔ فہرست مخطوطات شفیع (لاہور ۱۹۷۲ء)
کے صفحات ۳۰۲ ۔ [illegible] میں بھی ان کا ذکر ہے۔

(جہانگیر بادشاہ)۔ "اقبال نامہ جہانگیری" (محمد شریف معتمد خان) "مآثر جہانگیری" (خواجہ کامگار)۔ "شاہجہاں نامہ" (جلال الدین طباطبائی) "پادشاہ نامہ" (عبدالحمید لاہوری) "عمل صالح" (محمد صالح کنبوہ) "لطائف الاخبار" (بدیع الزماں) "تاریخ شاہ شجاعی" (محمد معصوم بن حسن بن صالح)۔ "ظفر نامہ عالمگیری" (عاقل خان رازی)۔ "عالمگیر نامہ" (محمد کاظم)۔ "مرآۃ العالم" (محمد بقا سہارن پوری) "رقائم کرائم" (اشرف خان حسینی)۔ "خلاصۃ التواریخ" (سجان سنگھ)۔ "مآثر عالمگیری" (محمد ساقی مستعد خان)۔ "جنگ نامہ اعظم شاہ و بہادر شاہ" (نعمت خان عالی)۔ "فرخ نامہ" (محمد منعم)۔ "عبرت نامہ" (مرزا محمد بن معتمد خان)۔ "منتخب اللباب" (خافی خان) "سیر المتاخرین" (غلام حسین طباطبائی)۔ "آئین عالمشاہی" (غلام علی خان)۔ "فتوحات نامہ صمدی" (غلام محی الدین)۔ "مثنوی تیمور شاہ ابدالی" (فیضی)۔ "بیان واقع" (عبدالکریم)۔ "تاریخ عالم آشوب (خیر الدین محمد الہ آبادی)۔ "ذکر السیر" (غلام حسین خان)۔ "ظفر نامہ وقائع غدر" (نامعلوم)۔ "خلاصۃ الاذکار" (اکبر علی سہارن پوری)۔ "جام جم" (سر سید احمد خان) وغیرہ وغیرہ[۱]

تاریخ کے علاوہ جغرافیہ، تذکرہ، افسانہ، فرہنگ، نجوم، ہیئت، ہندسہ، منطق، فلسفہ، تصوف، خطاطی وغیرہ مختلف علوم وفنون پر بھی فارسی میں بکثرت کتابیں ہیں کہ ان کا استقصا بہت مشکل ہے۔ پھر شعر و شاعری تو گویا فارسی کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے چنانچہ غزنوی عہد سے لے کر اب تک[۲]

۱۔ ڈاکٹر ایتھے کے کیٹلاگ میں برصغیر کے مختلف علاقوں کے متعلق تاریخوں کی بھی تفصیل ملتی ہے۔

۲۔ ان شعراء اور نثر نگاروں کے متعلق راقم الحروف کی یہ کتاب دیکھیں۔
Persian Literature in Indo-Pakistan Sub-continent (Lahore — 1972)

ہمارے ملک میں برابر اس زبان میں کچھ نہ کچھ شاعری پائی جاتی ہے۔ نکتی لاہوری (م ۔ ۴۳۲ھ/۱۰۴۰ء) ابو الفرج رونی (م ۔ ۴۹۷ھ/۱۱۰۴ء) مسعود سعد سلمان لاہوری (م ۔ ۵۱۵ھ/۱۱۲۱ء) ۔ ناصرالدین قباچہ (م ۔ ۶۲۴ھ/۱۲۲۷ء) کے درباری شعراء یعنی فضلی ملتانی، ضیاء الدین شمس الدین وغیرہ عمید الدین سنّامی (م ۔ ۶۸۳ھ/۱۲۸۴ء) فخرالدین عراقی (م ۔ ۶۸۸ھ/۱۲۸۹ء) شیخ عثمان سہوانی (م ۔ ۶۷۳ھ/۱۲۷۴ء) ابو علی قلندر پانی پتی (م ۔ ۷۲۴ھ/۱۳۲۴ء) ۔ امیر خسرو (م ۔ ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء) حسن سنجزی (م ۔ ۷۳۷ھ/۱۳۳۶ء) بدر چاچ (م ۔ ۷۴۴ھ/ کے بعد) ضیا نخشبی بدایونی (م ۔ ۷۵۱ھ/۱۳۵۰ء) مطہّر (م ۷۹۱ھ/۱۳۸۹ء) مسعود بک (م ۔ ۸۰۰ھ/۱۳۹۷ء) ۔ سید محمد گیسو دراز (م ۔ ۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء) جمالی (م ۔ ۹۴۲ھ/۱۵۳۵ء) پھر خود بابر بادشاہ (م ۔ ۹۳۷ھ/۱۵۳۰ء) اور ہمایوں بادشاہ (م ۔ ۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء) اور ان کے دربار کے بیرم خان (م ۔ ۹۶۸ھ/۱۵۶۰ء) نادری (م ۔ ۹۶۶ھ/۱۵۵۸ء) اور فارغی (م ۔ ۹۴۰ھ/۱۵۳۳ء) پھر شیخ عبدالقدوس گنگوہی (م ۔ ۹۴۴ھ/۱۵۳۷ء) ۔ قاسم کاہی (م ۔ ۹۶۳ھ/ کے بعد) شیخ گدائی دہلوی (م ۔ ۹۹۷ھ/۱۵۸۹ء) خواجہ حسین مروزی (م ۔ ۹۸۰ھ کے بعد) ۔ غزالی مشہدی (م ۔ ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء) ابوالفیض فیضی (م ۔ ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵ء) عبدالرحیم خان خاناں (م ۔ ۱۰۳۶ھ/۱۶۲۶ء) نظیری (م ۔ ۱۰۲۳ھ/۱۶۱۴ء) عرفی (م ۔ ۹۹۹ھ/۱۵۹۱ء) ۔ نامی (م ۔ ۱۰۱۹ھ/۱۶۱۰ء) ظہوری (م ۔ ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء) طالب آملی (م ۔ ۱۰۳۶ھ/۱۶۲۶ء) جہانگیر بادشاہ (م ۔ ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۸ء) ۔ ہاشم کشمی (م ۔ ۱۰۵۴ھ/۱۶۴۴ء) منیر لاہوری (م ۔ ۱۰۵۵ھ/۱۶۴۵ء) ۔ قدسی (م ۔ ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء) ۔ ابوطالب کلیم (م ۔ ۱۰۶۱ھ/۱۶۵۱ء) ۔ مرزا صائب (م ۔

۱۰۶۶ھ/۱۶۵۶ء)۔ سرمد رم۔ ۱۰۷۱ھ/۱۶۶۰ء)۔ غنی کشمیری رم۔ ۱۰۷۲ھ/
۱۶۶۱ء) خوشحال خان خٹک رم۔ ۱۱۰۰ھ/۱۶۸۸ء) مرزا معزالدین فطرت
رم۔ ۱۱۰۱ھ/۱۶۸۹ء) عاقل خان رازی رم۔ ۱۱۰۸ھ/۱۶۹۶ء)
ناصر علی سرہندی رم۔ ۱۱۰۸ھ/۱۶۹۶ء) غنیمت کنجاہی رم۔ ۱۱۱۰ھ/
۱۶۹۸ء) نعمت خان عالی رم۔ ۱۱۲۱ھ/۱۷۰۹ء)۔ خواجہ عبدالاحد وحدت
سرہندی رم۔ ۱۱۲۶ھ/۱۷۱۴ء)۔ مرزا عبدالقادر بیدل رم۔ ۱۱۳۳ھ/
۱۷۲۱ء)۔ میر عبدالجلیل بلگرامی رم۔ ۱۱۳۸ھ/۱۷۲۵ء)۔ سعداللہ گلشن
رم۔ ۱۱۴۰ھ/۱۷۲۷ء) ملا عبدالحکیم عطا ٹھٹھوی رم۔ ۱۱۴۰ھ/۱۷۲۷ء)
سراج الدین علی خان آرزو رم۔ ۱۱۶۶ھ/۱۷۵۶ء)۔ نورالعین واقف رم۔
۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء)۔ مرزا جان جاناں مظہر رم۔ ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء)۔ مرزا
محمد رفیع سودا رم۔ ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء)۔ خواجہ میر درد رم۔ ۱۱۹۹ھ/
۱۷۸۴ء)۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی رم۔ ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء) شیخ محمد علی
حزین رم۔ ۱۲۰۸ھ/۱۷۹۴ء)۔ میر علی شیر قانع ٹھٹھوی رم۔ ۱۲۰۳ھ/
۱۷۸۹ء)۔ میر عظیم الدین عظیم ٹھٹھوی رم۔ ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء)۔ میر غلام
علی مائل رم۔ ۱۲۵۱ھ/۱۸۳۵ء)۔ میر قمرالدین منت رم۔ ۱۲۰۸ھ/۱۷۹۴ء)
میر تقی میر رم۔ ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء)۔ محمد حسن قتیل رم۔ ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۷ء)
انشاءاللہ خان انشا رم۔ ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء)۔ مومن خان مومن رم۔
۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء)۔ امام بخش صہبائی رم۔ ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء) نواب
مصطفیٰ خان شیفتہ رم۔ ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء)۔ اسداللہ خان غالب رم۔
۱۲۸۵ھ/۱۸۶۹ء)۔ الطاف حسین حالی رم۔ ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۴ء)
مولانا شبلی نعمانی رم۔ ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء)۔ گرامی جالندھری رم۔ ۱۳۴۵ھ/
۱۹۲۷ء)۔ گل محمد خان زیب رم۔ ۱۳۵۰ھ کے بعد) علامہ اقبال رم۔
۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء) وغیرہ وغیرہ سیکڑوں شعراء نے مختلف اصناف سخن

استعمال کیے۔ البتہ علامہ اقبال نے فارسی، نیز اردو شاعری کو نئے خیالات
اور نئے جذبات سے مستفید کیا اور قوم کو بیدار کرنے کے لیے فکر و عمل
دونوں کے پیغام دیے۔

فارسی نثر نگاروں میں "حضرت داتا گنج بخش لاہوری" (م ۴۶۹ھ/
۱۰۷۶ء) سے اب تک ہزاروں اہل قلم ہوئے ہیں۔ کچھ نام یہاں بھی گنوائے
جا سکتے ہیں:۔

فخرالدین مبارک شاہ (م۔ ۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء کے بعد) علی بن حامد کوفی
(م۔ ۶۱۷ھ/ ۱۲۲۰ء تقریباً)۔ تاج الدین حسن نظامی (م۔ ۶۲۶ھ/
۱۲۲۸ء کے بعد)۔ محمد عوفی (م۔ ۶۲۵ھ کے بعد)۔ قاضی منہاج (م۔
۶۶۵ھ/۱۲۶۷ء)۔ امیر خسرو (م۔ ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء)۔ حسن سجزی (م۔
۷۳۷ھ/۱۳۳۶ء)۔ ضیاء الدین نخشبی بدایونی (م۔ ۷۵۱ھ/۱۳۵۰ء)
ضیاء الدین برنی (م۔ ۷۵۸ھ/۱۳۵۷ء)۔ سید مبارک کرمانی (م۔ ۷۷۰ھ/
۱۳۶۸ء)۔ حضرت شرف الدین یحییٰ منیری (م۔ ۷۸۲ھ/۱۳۸۱ء) شمس
سراج عفیف (م۔ ۸۰۱ھ/۱۳۹۸ء کے بعد)۔ سید محمد گیسو دراز (م۔
۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء)۔ محمود گاوان (نویں صدی ہجری)۔ عبدالرحیم خان خاناں
(م۔ ۱۰۳۶ھ/۱۶۲۶ء)۔ مخدوم نوح ہالائی سندھی (م۔ ۹۹۸ھ/۱۵۹۰ء)
عبدالقادر بدایونی (م۔ ۱۰۰۶ھ/۱۵۹۷ء)۔ میر معصوم بھکری سندھی (م۔ ۱۰۱۹ھ/
۱۶۱۰ء)۔ ملا نظام الدین (م۔ ۱۰۰۲ھ کے بعد)۔ گلبدن بیگم (م۔ ۱۰۱۲ھ/
۱۶۰۳ء)۔ ابوالفضل (م۔ ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء)۔ نور اللہ شوستری (م۔ ۱۰۱۹ھ/
۱۶۱۰ء)۔ نور الدین ظہوری (م۔ ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء)۔ محمد قاسم ہندو شاہ
(م۔ ۱۰۱۸ھ/کے بعد)۔ خواجہ باقی باللہ دہلوی (م ۱۰۱۲ھ/۱۶۰۳ء) حضرت
مجدد الف ثانی سرہندی (م۔ ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء)۔ جہانگیر بادشاہ (م۔ ۱۰۳۷ھ/
۱۶۲۸ء)۔ ہاشم کشمی (م۔ ۱۰۵۴ھ/۱۶۴۴ء)۔ عبدالحق محدث دہلوی (م۔

۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء) عبدالحمید لاہوری (م۔ ۱۰۶۵ھ/۱۶۵۴ء)۔ محمد صالح کنبوہ
(بارہویں صدی کی ابتدا)۔ سید طاہر محمد ٹھٹھوی (م۔ ۱۰۵۱ھ/ کے بعد)
دارا شکوہ (م۔ ۱۰۷۰ھ/۱۶۵۹ء)۔ اورنگ زیب بادشاہ (م۔ ۱۱۱۵ھ/
۱۷۰۴ء)۔ عبدالاحد وحدت سرہندی (م۔ ۱۱۲۶ھ/۱۷۱۴ء) محمد افضل
سرخوش (م۔ ۱۱۲۶ھ/۱۷۱۴ء) نعمت خان عالی (م۔ ۱۱۲۱ھ/ ۱۷۰۹ء)
خافی خان (م۔
۱۱۲۵ھ کے بعد) شاہ نواز خان (م۔ ۱۱۶۰ھ کے بعد)۔ شاہ ولی اللہ محدث
دہلوی (م۔ ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء)۔ شیخ محمد اعظم ٹھٹھوی (م۔ ۱۱۹۰ھ/ کے بعد)
میر علی شیر قانع ٹھٹھوی (م۔ ۱۲۰۳ھ/ ۱۷۸۹ء)۔ عطا محمد شکارپوری
سندھی (م۔ ۱۲۷۱ھ کے بعد)۔ امام بخش صہبائیؔ (م۔ ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء)
نواب مصطفیٰ خان شیفتہ (م۔ ۱۲۸۶ھ/ ۱۸۶۹ء) مولانا شبلی نعمانی (م ۱۳۳۲ھ/
۱۹۱۴ء) وغیرہ وغیرہ۔ ان نثر نگاروں کی تصانیف میں سلیس اور مسجع اور
مقفیٰ نثر ہر طرح کی موجود ہے۔ اور موضوعات کے لیے کوئی خاص قسم مقرر
نہیں ہے۔ البتہ منشآت کے لیے عموماً مرصع نثر استعمال کی جاتی تھی۔ جس کا
رواج اب ختم ہو چکا ہے۔ بہرحال فارسی کی مقبولیت کا اندازہ اس ایک
مثال سے بھی ہو سکتا ہے کہ اردو شعراء کے تذکرے بھی فارسی میں لکھے
جاتے تھے۔ مثلاً "نکات الشعراء" (میر تقی میر) "گلشن گفتار" (حمید اورنگ آبادی)
"تحفۃ الشعراء" (افضل بیگ قاقشال)۔ "مخزن نکات" (قائم چاند پوری)
"چمنستان شعراء" (لچھمی نرائن شفیق)۔ "عیار الشعراء" (خوب چند ذکا)۔
"تذکرۂ ہندی گویاں" (مصحفی)۔ "ریاض الفصحا" (مصحفی)۔ "مجموعۂ نغز"
(قدرت اللہ قاسم)۔ "گلزار ابراہیم" (ابراہیم علی خان)۔ "گلشن بیخار"
(مصطفیٰ خان شیفتہ) وغیرہ۔ البتہ مرزا علی لطف نے "گلزار ابراہیم" کو
۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء میں "گلشن ہند" کے نام سے اردو میں منتقل کیا اور مفید

اضافے بھی کیے۔ اردو میں اردو شعراء کا یہ پہلا تذکرہ سمجھا جاتا ہے۔

موجودہ دور میں علماء اور ادباء کی زبانوں پر فارسی الفاظ اور ترکیب بہرحال قائم ہیں اور ہمارے اطبا تو اب تک اپنے نسخے فارسی ہی میں لکھا کرتے ہیں[1]۔

(ج)۔ اردو علم و ادب

اردو ادب کی تشکیل و تعمیر میں شروع سے مسلمان ہی شریک غالب ہیں اور برصغیر کے ہر علاقہ میں ان کی خدمات یادگار ہیں۔ بزرگان دین کے ملفوظات، ان کے فقرے، ان کی شاعری اور ان کی چھوٹی بڑی تصانیف بڑی حد تک محفوظ کر لی گئی ہیں، پھر دوسرے شعراء اور مصنفین نے اتنا بڑا ادبی سرمایہ مہیا کیا ہے کہ اس کا سمیٹنا بھی آسان نہیں۔ عربوں کی آمد سے عربی اور مقامی زبانوں کی آمیزش شروع ہوئی لیکن محمود غزنوی (م۔ ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء) کے عہد سے لسانی اور معاشرتی تعلقات میں زیادہ وسعت پیدا ہوئی۔ پھر مختلف مسلمان حکومتوں کے قیام سے مشترکہ زبان و ادب (اردو) کے ارتقا میں بڑی مدد ملی۔ چوتھی صدی ہجری تک اسلامی دنیا کی مشترک زبان (عربی) تھی۔ برصغیر میں غزنوی عہد سے تدریجاً فارسی کو فروغ ہوا اور اس فروغ سے ہمارے ملک کے ادب میں فارسی روایات غالب ہوئیں اور مختلف اصناف سخن میں ان کا تعلق ایک اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ "اردو غزل" تو سراپا ابھی روایات کی مرہون منت ہے اور گیارھویں صدی ہجری سے اب تک اسی ڈگر پر چل رہی ہے۔ حسن شوقی (م۔ ۱۰۴۳ھ/۱۶۳۳ء)۔ ولی (م۔ ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء)۔ سودا (م۔ ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء)۔ درد (م۔

---

[1]۔ عہد بعہد کی فارسی میں ملکی اثرات کی وجہ سے جو تغیرات ہوئے ہیں ان کی تفصیل راقم الحروف کی کتاب "فارسی پر اردو کا اثر" میں ملاحظہ فرمائیں۔

۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء)۔ میر (م۔ ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء)۔ انشا (م۔ ۱۲۳۳ھ
/۱۸۱۷ء)۔ مصحفی (م۔ ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء)۔ ناسخ (م۔ ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء)
آتش (م۔ ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۶ء)۔ شاہ نصیر (م۔ ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء)
مومن (م۔ ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء)۔ ذوق (م۔ ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء)
ظفر (م۔ ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء)۔ غالب (م۔ ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۹ء)
حالی (م۔ ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۴ء)۔ امیر مینائی (م۔ ۱۳۱۸ھ/ ۱۹۰۰ء)
داغ دہلوی (م۔ ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۵ء)۔ شاد عظیم آبادی (م۔ ۱۳۴۵ھ/۱۹۲۷ء)
علامہ اقبال (م۔ ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء)۔ حسرت موہانی (م۔ ۱۳۷۰ھ/ ۱۹۵۱ء)
وغیرہ وغیرہ کتنے شعراء ہوئے ہیں جنھوں نے غزل میں فارسی روایات کو
برقرار رکھا اور اپنے مخصوص رجحانات کے باوجود ان روایات سے انحراف
نہیں کیا۔ ذیلی اصناف سخن اس (غزل) کے علاوہ ہیں۔ اور ان کے نمائندے
بھی بکثرت ہیں۔ نثری تصانیف بھی بے شمار ہیں۔ پھر اردو کے "دینی ادب"
میں (۱) "قرآنی تراجم و تفاسیر"۔ (۲) "تجوید و قرأت"۔ (۳) "حدیث"
(۴) "فقہ"۔ (۵) "سیرت طیبہ"۔ "میلاد نامے"۔ (۷) "تصوف"۔ (۸)
"نعتیہ شاعری"۔ (۹) "منقبت نگاری"۔ (۱۰) "صوفیانہ شاعری"۔ (۱۱)
"اخلاقی شاعری"۔ (۱۲) "سیاسی شاعری"۔ (۱۳) "مرثیہ نگاری"۔ (۱۴)
"اخبار اور رسالے"۔ بھی شامل ہیں جن کی تفصیل ان کے عنوانات کے ذیل
میں عرض کردی گئی ہے اور ان کا یہاں دہرانا تحصیل حاصل ہے۔

"مقفیٰ اور مسجع نثر" بھی اردو میں تھی۔ ملا وجہی نے ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء)
میں ایسی نثر میں "سب رس" لکھی۔ فضلی کی "کربل کتھا" جو پہلی بار ۱۱۶۰ھ)
۱۷۴۷ء) میں لکھی گئی۔ اس قسم کی نثر کے نمونے پیش کرتی ہے۔ پھر سودا
(م۔ ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء) کے دیوان مرثیہ کے دیباچے میں بھی ایسی ہی نثر

ہے۔ شاہ عبدالقادر دہلوی (م - ۱۲۳۰ھ / ۱۸۱۵ء) کی موضح قرآن میں (اور غالب کی نثر میں بھی) کہیں کہیں قافیہ آرائی ہے۔ انشاء (م۔ ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۷ء) - کی گفتگو[۲] میں بھی نثر ہے اور عطا حسین تحسین نے جب "نوطرز مرصع" ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۸ء میں مکمل کی تو اسے بھی "مرصع" بنایا۔ بلکہ میر امن کی "باغ و بہار" جو ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء میں مکمل ہوئی۔ اپنی سلاست اور دلکشی کے باوجود کہیں کہیں قافیہ آرائی ضرور پیش کرتی ہے۔ میرزا علی لطف نے "تذکرۂ گلشن ہند" میں جو ۱۲۱۵ھ ۱۸۰۰ء میں لکھا گیا ایسی ہی نثر کو اکثر و بیشتر استعمال کیا ہے۔ میر بہادر علی حسینی نے "نثر بے نظیر" (۱۲۱۷ھ / ۱۸۰۲ء)[۳] میں اور بعد میں مرزا رجب علی بیگ سرور نے "فسانۂ عجائب" (۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۴ء) میں اسی نثر کو قائم رکھا ہے۔ بہرحال ایسی نثر "سرسید" (م۔ ۱۸۹۸ء) کی بدولت ہر مقصد کے لیے "سلاست" میں منتقل ہوگئی اور ان کے رفقا نے اسے بام عروج پر پہنچا دیا۔

ان کے علاوہ اردو میں تذکرے، ترجمے، تبصرے، خطبے، مقدمے، خاکے، انشائیے، مقالے، افسانے، تمثیلیں، تنقیدیں، تاریخیں وغیرہ وغیرہ[۴] کیا کیا نہیں لکھا گیا اور کیا کیا نہیں لکھا جا رہا ہے۔ پھر "صوبائی" اور "علاقائی" زبانوں کا علمی اور ادبی سرمایہ اس کے علاوہ ہے۔ چنانچہ برصغیر کے مسلمانوں کی لاکھوں اور گوناگوں تصانیف کا سرمایہ اس قدر وافر ہے کہ وہ دوسرے ممالک کے مسلمان بھائیوں کے مقابلے میں کسی طرح کم

۱۔ موضح قرآن تاریخی نام ہے یعنی ۱۲۰۵ھ میں لکھی گئی۔ لیکن اس کا نام موضح القرآن مشہور ہو گیا۔

۲۔ بحوالہ آب حیات لاہور، ۱۹۵۰ء۔ صفحہ ۲۴)۔

۳۔ حامد حسن قادری مرحوم کی داستان تاریخ اردو (آگرہ ۱۹۴۱ء) کے صفحہ ۱۲۹-۱۵۱

(باقی اگلے صفحہ پر)

نہیں اور مشرق و مغرب کے بکثرت کتب خانے اس دعویٰ کے لیے برہان قاطع ہیں۔

بقول اقبالؔ

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

اس اجمال کے بعد مختلف عنوانات کے تحت ہمارے علمی اور ادبی سرمایہ کی تفصیل آیندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

☆

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

وغیرہ میں بھی ایسی نثر کے نمونے ملتے ہیں۔

۴ے علوم اشیا (سائنس) کے لیے خواجہ حمید الدین شاہد کی کتاب "اردو میں سائنسی ادب" (کراچی ۱۹۶۹ء) دیکھیں۔

اردو کا دینی ادب - ۱۸۵۷ء کے بعد

دنیا کے لیے اسلام رحمت بن کر آیا۔ اس نے ایک خدا کی پرستش سکھائی۔ اور انسانوں کو نیابت الٰہی کے بلند ترین منصب سے آگاہ کیا۔ برصغیر پاک و ہند میں جب توحید عام کی گئی تو ہندوؤں میں بھی توحیدی افکار کا ظہور ہونے لگا اور اسلامی تصوف سے متاثر ہو کر ان کے اندر بھگتی تحریک نے جنم لیا جس کے اہم ارکان چیتنیا، میراں جی، سور داس اور تلسی داس تھے جنھوں نے عوام ہی کی زبان کو ذریعۂ ابلاغ بنایا۔ یہی زبان بعد میں اردو کہلائی۔

سولھویں سترھویں صدی عیسوی میں عیسائی اقوام، ہندستان میں وارد ہوئیں اور انھوں نے بتدریج سیاسی اثر و رسوخ قائم کر کے عیسائیت کی ترویج کے لیے اردو ہی کو استعمال کیا۔ اقبال نے صحیح کہا ہے :-

متاعِ غیر پہ ہوتی ہے جب نظر اس کی
تو ہیں ہراول لشکر، کلیسا کے سفیر

انگریز پادریوں نے حکومت کی شہ پر مسجدوں اور مندروں کے سامنے اور گلیوں میں بھی عیسائیت کی تبلیغ کی اور مناظرے شروع کیے۔ رسالے اور کتابیں بھی (اردو میں) شایع کیں۔ پادری فنڈر (Bishop Pfander)، پادری عماد الدین پانی پتی اور ماسٹر رام چندر دہلوی بڑے سرگرم مناظر تھے۔ ان کے مقابلے کے لیے مولانا رحمت اللہ کیرانوی (م- ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۱ء) ڈاکٹر وزیر خان، مولانا آلِ حسن، مولانا ابو المنصور دہلوی وغیرہ کھڑے ہوئے اور انھوں نے بکثرت کتابیں

اور رسالے ردنصاریٰ میں لکھے۔ ہندوؤں میں "برہمو سماج" اور "آریا سماج" تحریکیں بھی مسیحی مناظرہ بازوں کی انگیخت پر وجود میں آئیں اور انھوں نے بھی اردو کو ذریعہ ابلاغ بنایا۔ جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) میں ناکامی کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ ایک مغلوب قوم کی حیثیت سے حاکم قوموں کی چیرہ دستیوں کے علاوہ انھیں عقائد اور افکار کے میدان میں بھی بہت سے فتنوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ سرسیّد جو اپنی ذات میں ایک انجمن تھے اور مسلمانوں کی شکست کے بھیانک مناظر آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ یہی مناسب سمجھتے تھے کہ راعی اور رعایا کو قریب تر لایا جائے۔ چنانچہ انھوں نے تحقیق لفظ نصاریٰ، تبیین الکلام، احکام طعام با اہل کتاب وغیرہ کتابیں لکھیں اور ایم۔ اے۔ او کالج بھی اسی مقصد سے قائم کیا۔ پھر انیسویں صدی عیسوی میں یورپ کے فلسفہ اور سائنس میں جو الحاد اور دہریت کا رجحان غالب ہو رہا تھا اس کے مقابلے کے لیے سرسیّد نے اسلام کی ایسی توجیہ کرنے کی کوشش کی جو یورپ کے لیے قابل قبول ہو۔ خطبات احمدیہ (سر ولیم میور کے جواب میں) کے علاوہ انھوں نے ایک نیا علم کلام پیش کرنے کی کوشش کی اور مسلک اعتزال کا از سر نو احیا کیا۔ مولانا شبلی نے بھی الکلام اور علم الکلام اشاعرہ کے برخلاف معتزلہ کے مسلک کو ترجیح دی۔ نیاز فتحپوری (مدیر رسالہ نگار) بھی اسی مسلک کی آزادانہ تبلیغ کرتے رہے۔ لیکن سید سلیمان ندوی اور ابوالکلام آزاد نے از سر نو اشاعرہ کے مسلک کو غالب کیا۔ مولانا اشرف علی تھانوی کی بھی یہی کوشش رہی اور جدید دور میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے الجہاد فی الاسلام، تنقیحات اور سود وغیرہ کتابوں کے ذریعہ مغربی افکار اور عقلیات کا محاکمہ کیا ہے۔ عبدالوحید خان کی

کتاب "عہد جدید کا چیلنج اور اسلام" اس سلسلے کی اہم تصنیف ہے۔

عقلی تاویل پیش کرتے وقت سرسید احمد خان نے بعض صحیح احادیث کا انکار کر دیا جس سے انکار حدیث کی رو چل پڑی۔ مولوی چراغ علی نے تحقیق الجہاد میں اس رو کو تقویت پہنچائی۔ اور اس مسلک (انکار حدیث) کو مولوی اسلم جیراجپوری جیسے عالم اور چوہدری غلام احمد پرویز جیسے ادیب مل گئے جنھوں نے اس کی تبلیغ کی۔ اس تحریک کا شاخسانہ "تحریکِ اہلِ قرآن" بھی ہے جسے مولوی عبداللہ چکڑالوی نے فروغ دیا۔

تاریخ اسلام اور سیرت نگاری کے جدید رجحانات بھی سرسید کے رہینِ منت ہیں۔ خطبات احمدیہ دراصل سیرت نگاری کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ مسدس حالی جو سرسید نے لکھوایا تھا ایک لحاظ سے مسلمانوں کا قومی رجز ہے اور شبلی کی الفاروق، المامون، النعمان اور الغزالی وغیرہ سب سرسید کی ترغیب کی یادگار ہیں۔ تاریخ اسلام سے اس شغف کی وجہ سے دارالمصنفین (اعظم گڑھ) نے سیرۃ النبیؐ، سیرۃ الصحابہؓ، تابعین رضؓ، تبع تابعین رضؓ وغیرہ کتابیں شائع کیں اور اسی انداز پہ دہلی کے ندوۃ المصنفین نے بھی بڑی قابل قدر تحقیقی کتابیں شایع کی ہیں۔ پاکستان میں بھی اسی نمونے پر ادارۂ ثقافت اسلامیہ (لاہور) اور ادارۂ تحقیقات اسلامی (اسلام آباد) قائم ہیں۔

تاریخ پر سرسید نے ناقدانہ تبصرہ بھی کیا ہے جیسا کہ مولوی مہدی حسن سے ان کی مراسلت واضح کرتی ہے۔ اس رجحان کو ان کے بعد مرزا حیرت دہلوی نے بڑی تقویت پہنچائی۔ چنانچہ انھوں نے واقعات کربلا سے متعلق چار مجلدات تیار کر کے جمہور مؤرخین کی روش سے ابا کیا۔ اور ابھی قریب زمانے میں محمود احمد عباسی نے بھی "خلافت معاویہؓ و یزید" وغیرہ میں ان واقعات کی تغلیط کی اور گزشتہ دور میں یورپ کے مستشرقین

(مثلاً وِلہازن۔ گولڈ زیہر اور نولدیکی وغیرہ) نے تاریخ اسلام کے خلاف جو کچھ مواد اکٹھا کیا تھا وہ ایک طرح سے عباسی نے اردو میں منتقل کر دیا۔

سر سید کا وہ رجحان جو راعی سے رعایا کو قریب تر کرنے کا تھا تحریک خلافت سے یکسر ختم ہوگیا اور اب عامۃ المسلمین کا سیاسی اور دینی شعور پوری قوت سے بیدار ہوا۔ محمد علی جوہر کا ہمدرد (کلکتہ) ابوالکلام آزاد کا الہلال (کلکتہ) اور ظفر علی خان کا زمیندار (لاہور) اسلامی قومیت کے احیاء کے لیے سرگرم رہا۔ بلکہ اس تصور کو منفی طور پر "شدھی سنگھٹن" کی معاندانہ تحریک نے بھی تقویت پہنچائی۔ پھر علامہ عنایت اللہ مشرقی کی خاکسار تحریک بھی (جارحانہ انداز پر) مسلم قومیت کے لیے اُبھری۔ علامہ مرحوم کی کتابیں اور ان کا رسالہ "الاصلاح" اس تحریک کے معاون تھے اور مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی تبلیغی جماعت جو دراصل میواتیوں کو اسلام سکھانے کے لیے تشکیل پذیر ہوئی تھی، خصوصاً ۱۹۴۷ء کے بعد کے حالات میں بہت مفید ثابت ہوئی۔ اس نے نہ صرف خود کو بلکہ اردو کو بھی بین الاقوامی مقبولیت عطا کی ہے۔ مولانا محمد زکریا سہارنپوری کی کتاب "نصابِ تبلیغ" اور "فضائل صدقات" نیز مولانا یوسف کاندھلوی کی "حیات الصحابہؓ" (دس حصے) بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

سر سید کے مقابل، دارالعلوم دیوبند کی تحریک شروع ہی سے انگریزی استعمار سے ٹکر لے رہی تھی۔ مولانا مملوک علی، حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا ذوالفقار علی، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، شیخ الہند محمود حسن، مولانا اشرف علی تھانوی، پھر وہاں کے فارغ التحصیل علماء مثلاً مولانا ممتاز علی (بانی دارالاشاعت لاہور) مولانا محمد نجیب آبادی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا مظہر الدین

شیر کوٹی، (مدیر وحدت و الامان) مولوی مجید حسن (مالک مدینہ اخبار بجنور) مولانا انور شاہ کشمیری، مفتی حبیب الرحمٰن، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، قاری محمد طیب، مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا غلام اللہ خان، مفتی محمد شفیع وغیرہ اکابر میں سے ہیں اور انھوں نے اکثر کتابیں اردو ہی میں لکھیں۔ مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا احمد سعید، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاری، مولانا محمد میاں (۔مسلمانوں کا شاندار ماضی ۵ حصے) اور بعد میں مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے تلامذہ نے کبھی بھی حکومت برطانیہ کو گوارا نہیں کیا[1]

معقولیین میں مولانا فضل حق خیر آبادی اور ان کے تلامذہ نے شاہ اسماعیل دہلوی اور شاہ اسحٰق دہلوی کے بعض خیالات کی سختی سے تردید کی۔ شاہ احمد سعید نے مسائل اربعین لکھی۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے شاگرد مولانا محبوب علی دہلوی بھی ان کے ہم خیال تھے۔ "بریلوی مکتب فکر" اسی تردید کے لیے سرگرم رہا۔ مولانا فضل رسول بدایونی نے بھی اس مکتب کی تائید کی۔ مولانا احمد رضا خان نے ۵۴۸ کتابیں لکھیں جن میں سے اکثر اردو میں ہیں۔ ان کا ترجمۂ قرآن پاک عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سرشار ہے۔ ان کے شاگرد مولانا امجد علی کی بہار شریعت (سترہ حصے) فقہ پر بے مثل محققانہ تصنیف ہے۔ مولانا نعیم الدین مراد آبادی نے بھی دین کی تبلیغ میں بہت کام کیا ہے اور اردو میں کئی کتابیں لکھی ہیں۔

---

[1] عزیز گرامی پروفیسر محمد ایوب قادری نے اردو نامہ، کراچی، شمارہ نمبر ۱۵ میں ایک مختصر لیکن فاضلانہ مضمون "اردو میں مذہبی ادب" (تحریکات و شخصیات) لکھا ہے، اس تفصیل کے لیے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

مولانا غلام [illegible] (قصوری)، [illegible] علی (اوّل ثم لاہوری)، مفتی احمد
یار خان، مولانا اشرف نوشاہی)، مولانا احمد سعید کاظمی ملتانی، مولانا محمد شفیع
اکاڑوی، حکیم محمد موسیٰ امرتسری وغیرہ۔ پھر دکن میں مولانا مناظر احسن گیلانی،
مولانا عبدالقدیر صدیقی (مفسر قرآن) پروفیسر الیاس برنی، ڈاکٹر حمید اللہ
(مقیم پیرس) ڈاکٹر میر ولی الدین، پروفیسر عبدالباری، پروفیسر غلام دستگیر
پروفیسر مظہر الدین صدیقی، نواب حبیب الرحمن خان شیروانی (صدر الصدور)
مولانا انوار اللہ خان، مولانا وکیل احمد سکندر پوری وغیرہ نے زیادہ تر اردو
ہی میں کتابیں لکھی ہیں۔ شیعہ حضرات میں مولوی ابن حسن جارچوی، ذاکر حسین
فاروقی (شیعی) آغا مہدی لکھنوی وغیرہ اور ان کے ادارے جو لاہور اور
کراچی میں ہیں اردو ہی میں کام کر رہے ہیں۔

جماعت اسلامی کی اردو خدمات بھی خصوصیت رکھتی ہیں۔
موجودہ دور میں یہ جماعت ۱۹۴۱ء میں قائم ہوئی۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے قریب دو سو
چھوٹی بڑی کتابیں لکھی ہیں اور ان کا رسالہ ترجمان القرآن جو ۱۹۳۲ء سے جاری
ہے مختلف دینی اور علمی مباحث کے لیے مضامین شایع کر رہا ہے۔ مولانا کی
تفسیر تفہیم القرآن اور ان کی بعض کتابیں معرکۃ الآرا ہیں۔ مثلاً الجہاد فی الاسلام
سنت کی آئینی حیثیت، خلافت و ملوکیت، تنقیحات، اسلامی ریاست
تجدید و احیاء دین وغیرہ۔ اور ان سب کا مقصد اسلام کو غالب نظام
اور اس کو قابل عمل ثابت کرنا ہے۔ بہرحال علمائے اسلام اور اولیائے
کرام نے تدریس و تلقین کے لیے اردو ہی کو اختیار کیا اور اب وہ عالم
اسلام کی اہم ترین زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔ غیر منقسم ہندوستان
کے وہ علاقے جہاں تامل، تلنگی، مرہٹی اور بنگالی وغیرہ زبانیں پوری
طرح مسلط تھیں وہاں کے مسلمان گھرانوں میں بھی اردو بولی جاتی تھی۔
اسی لیے تمام مسلم لیڈروں نے ہر جگہ تحریر و تقریر میں اسی زبان کو

اختیار کیا اور مسلم لیگ نے الٰہ آباد کے اجلاس (۱۰ /اکتوبر ۱۹۳۷ء) میں اردو ہی کو قومی زبان قرار دیا۔ پھر مولانا اشرف علی تھانوی نے رسالہ النور (تھانہ بھون) بابت رمضان المبارک ۱۳۵۸ھ (اکتوبر ۱۹۳۹ء) میں ایک طویل مقدمے کے ساتھ یہ فتویٰ شایع کیا۔

"...... اس انتاج کے بعد معلوم ہو گیا کہ اس وقت اردو زبان کی حفاظت دین کی حفاظت ہے۔ اس بناء پر یہ حفاظت، حسب استطاعت طاعت اور واجب ہوگی اور باوجود قدرت کے، اس میں غفلت کرنا اور سستی کرنا معصیت اور موجب مواخذۂ آخرت ہوگا۔"

پاکستان بننے کے بعد بعض گوشوں سے مخالفت کے باوجود اردو ہی میں سب سے زیادہ دینی کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے اور برصغیر کے صرف وہ علاقے (مدراس سے لیکر پشاور تک) جو اردو سے وابستہ رہے ہیں ان کے فکری و عملی نظام میں افتراق اور انقطاع واقع نہیں ہوا۔ یہ اہم نکتہ "تحریک پاکستان کے طالب علم کے ذہن میں مستحضر رہنا چاہیے۔

اب ہم دینی ادب کے مختلف اصناف کا جائزہ لیتے ہیں۔

قرآنی تراجم و تفاسیر:-

قرآن پاک کی اردو تفاسیر دسویں صدی ہجری سے اور خالص تراجم تیرھویں صدی ہجری سے موجود ہیں اور ان کی مجموعی تعداد جیسا کہ اب تک دریافت ہو سکا ہے قریب سات سو ہے[1]

خالص تراجم میں سب سے قدیم ترجمہ عبدالعلی بلگرامی کا ہے جو ۱۲۰۰ء

---

[1] عزیزی ڈاکٹر محمد مسعود احمد نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں ان تراجم و تفاسیر کا مفصل ذکر کیا ہے۔ یہاں اسی مقالے سے یہ مضمون تیار کیا گیا ہے۔ کچھ معلومات اس کے علاوہ ہیں۔

۱۷۸۵ء) میں کیا گیا۔ پھر ۱۲۰۳ھ/۱۷۸۸ء میں شاہ رفیع الدین دہلویؒ نے کیا اور دو سال کے بعد شاہ عبدالقادر دہلویؒ نے اپنا ترجمہ مکمل کیا۔ اس کے بعد متعدد ترجمے کیے گیے اور انگریزوں کی آمد کے بعد ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء میں ایک عیسائی امام الدین اور ایک امریکی پادری پرسا ترین نے بھی اپنے اپنے ترجمے مکمل کیے۔ ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۵ء کے دو ترجمے اور ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء کا ایک ترجمہ برٹش میوزیم لندن میں بھی موجود ہے۔ ان کے مترجمین کے نام معلوم نہیں۔

۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء میں کنھیا لال الکھداری کا ترجمہ لدھیانہ سے شایع ہوا۔ ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء میں سید علی محمد کا ترجمہ (بلامتن) کانپور سے شایع ہوا۔ مولوی نذیر احمد دہلوی کا با محاورہ ترجمہ ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۵ء میں شایع ہوا۔ ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء میں فرمان علی اثنا عشری کا ترجمہ شایع ہوا۔

اسی زمانے میں سرسید اپنی تفسیر القرآن اور مولانا عبدالحق حقانی اپنی تفسیر فتح المنان لکھ رہے تھے۔ ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء میں مولانا فتح محمد جالندھری اور مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کے ترجمے شایع ہوئے۔

۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء میں نظام الدین حسن نانوتوی کا ترجمہ اور دوسرے سال وحید الزماں کا ترجمہ شایع ہوا۔ ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء میں عبداللہ چکڑالوی کا ترجمہ شایع ہوا اور سید احمد حسن اور مولوی ثناء اللہ امرتسری نے تفسیر کے ساتھ ترجمہ بھی مرتب کیا۔ دوسرے سال مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ترجمہ شایع ہوا۔

۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء میں حکیم نور الدین قادیانی کا ترجمہ آگرہ سے شایع ہوا۔ دو سال کے بعد مولانا احمد رضا خان بریلوی اور مرزا حیرت دہلوی کا ترجمہ شایع ہوا۔ پھر نواب وحید الزماں کا ترجمہ ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء میں اور ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۴ء میں مولانا محمود حسن کا ترجمہ شایع ہوا۔ اسی سال محمد علی کا ترجمہ مع تفسیر، لاہور سے شایع ہوا۔ دوسرے سال خواجہ حسن نظامی دہلوی کا ترجمہ شایع ہوا۔ ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۷ء میں حبیب احمد کیرانوی کا ترجمہ [illegible]

شایع ہوا۔ ۱۳۵۴ھ/ ۱۹۳۵ء میں بشیر الدین محمود کا ترجمہ اور دوسرے سال راحت حسین گوپال پوری کا ترجمہ شائع ہوا۔ اسی سال مولانا آزاد نے اپنا ترجمہ مکمل کیا۔ ۱۳۶۱ھ/ ۱۹۴۲ء میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فارسی ترجمے کا اردو ترجمہ مفتی مظہر اللہ دہلوی نے شایع کیا۔ ۱۳۶۶ھ/ ۱۹۴۶ء میں کچھوچھا شریف کے مولانا سید محمد اشرف کا جزوی ترجمہ شایع ہوا۔ دو سال کے بعد عبدالرحیم عرشی نے نصف قرآن کا منظوم ترجمہ کیا۔

۱۳۷۰ھ/ ۱۹۵۰ء میں عبدالدائم جلالی اور فیروز الدین روحی کے ترجمے شائع ہوئے۔ دوسرے سال احمد سعید دہلوی کا ترجمہ شایع ہوا۔ ۱۳۷۴ھ/ ۱۹۵۴ء میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی تفسیر تفہیم القرآن مرتب کی جس میں ترجمہ اور تفہیم دونوں ہیں اور اسی سال مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنا ترجمہ مع تفسیر شایع کیا۔ ۱۳۸۱ھ/ ۱۹۶۱ء میں غلام احمد پرویز کا ترجمہ مفہوم قرآن شایع ہوا۔ ۱۳۸۶ھ/ ۱۹۶۶ء میں محمد اویس کا منظوم ترجمہ کراچی سے شایع ہوا۔ اس کے بعد بھی کئی ترجمے شایع ہوئے۔

اردو تفاسیر کا آغاز دسویں صدی ہجری سے ہو چکا تھا اور اس وقت سے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے زمانے تک متعدد تفسیریں وجود میں آئیں۔ ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۵ء اور ۱۲۷۵ھ/ ۱۸۵۸ء کے درمیان نواب واجد علی شاہ نے کلکتہ کے زمانۂ اسیری میں صحیفۂ سلطانیہ کے نام سے جزوی تفسیر لکھی۔ اسی زمانے میں غلام محمد مہدی نے تفسیر لکھی۔ ۱۲۸۰ھ/ ۱۸۶۳ء میں محمد مرتضیٰ الہ آبادی کی منظوم تفسیر سورۃ یوسف لکھنو سے شایع ہوئی۔ ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۶ء میں قطب الدین دہلوی کی جامع التفاسیر اور دوسرے سال محمد مرتضیٰ الہ آبادی کی تفسیر مظہر العجائب شائع ہوئی۔ اسی سال عبدالسلام سلام کی منظوم تفسیر زاد الآخرہ

شایع ہوئی۔ ۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء میں سبغت اللہ مدراسی کی تفسیر فیض
الکریم (ابتدائی چھ پاروں کی) شایع ہوئی۔ دوسرے سال سید عمار علی
سونی پتی کی تفسیر عمدۃ البیان شائع ہوئی۔ ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء میں
امام علی اکبرآبادی کی جواہر القرآن شائع ہوئی۔ ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء میں
ملا حسین واعظ کاشفی کی تفسیر حسینی کا اردو ترجمہ فخر الدین لکھنوی نے
تفسیر قادری کے نام سے شائع کیا۔ اسی زمانے میں نواب صدیق حسن
خان (م ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء) نے اپنی تفسیر ترجمان القرآن (۱۵ جلدوں میں)
مکمل کی۔ پھر ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء سے ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۵ء کے درمیان
سرسید کی تفسیر القرآن ۶ جلدوں میں (نصف قرآن سے زیادہ) شائع
ہوئی۔ ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۴ء میں محمد عثمان سلیم الدین تسلیم نے تشریح القرآن
لکھی۔ ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء میں زین العابدین کی تفسیر کاشف الغم، دہلی
سے شائع ہوئی۔ دوسرے سال سید محمد امروہوی نے غایۃ البرہان فی تاویل
القرآن شائع کی۔ اسی زمانے میں نواب صدیق حسن خان نے اپنی عربی تفسیر
کی تلخیص ”ترجمان القرآن“ کو سات جلدوں میں تیار کیا لیکن تکمیل سے
پہلے ۱۸۹۰ء میں وہ فوت ہوگئے۔ ان کے بعد مولوی ذوالفقار احمد
اور مولوی محمد بن ہاشم نے اس کی تکمیل کی۔ ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء
میں عبدالحکیم کی جواہر التفسیر اور ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء میں ابو احمد محمد عبداللہ
کی البیان لفصاحۃ القرآن اور ابوالحسن حسن محمد کی منظوم تفسیر سورۃ
الشفاء (فاتحہ) شائع ہوئی۔ دوسرے سال فتح محمد تائب کی خلاصۃ التفاسیر
اور کئی علماء کی تیار کردہ اعظم التفاسیر شائع ہوئی۔ ۱۳۱۳ھ/
۱۸۹۵ء اور ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۸ء کے درمیان مولانا ثناء اللہ
امرتسری کی تفسیر ثنائی آٹھ جلدوں میں شائع ہوئی۔ ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء
میں مولانا عبدالحق حقانی کی تفسیر فتح المنان آٹھ جلدوں میں شائع

دو سال کے بعد عبداللہ خان نے منظوم خلاصۂ تفسیر القرآن
شائع ہوئی۔ اور خلیل احمد اسرائیلی نے امام رازی کی تفسیر
آگرہ سے شائع کیا۔ ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء
کبیر کی پہلی جلد کا ترجمہ سراج المنیر شائع کیا۔
میں مولانا فتح محمد جالندھری کی تفسیر القرآن امرتسر سے شائع ہوئی۔
۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء میں عبدالمجید دہلوی کی جزوی تفسیر تیسیر البیان
شائع ہوئی اور دوسرے سال ڈاکٹر عبدالحکیم کی تفسیر القرآن بالقرآن شایع ہوئی۔ ۱۳۲۲ھ
۱۹۰۴ء میں مولانا عبدالمقتدر بدایونی کی تفسیر (تفسیر عباسی کا ترجمہ) شایع ہوئی۔ دوسرے سال محمد انور
سنبھلی کی تفسیر جلالین (ترجمہ) اور مولوی وحید الزماں کی موضحۃ الفرقان
(تفسیر وحیدی) شائع ہوئی۔ ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء میں غلام احمد قادیانی
کی خزینۃ المعارف جلد اول (سورۃ فاتحہ) شائع ہوئی، جو محمد فضل
نے ان کی کتابوں سے اخذ کر کے جمع کی تھی۔ دوسرے سال محمد اشرف
نے تفسیر مظہری کا اردو ترجمہ شائع کیا اور اسی سال مولانا اشرف
علی تھانوی کی تفسیر بیان القرآن مکمل ہوئی۔ اسی سال سید احمد حسن
دہلوی کی احسن التفاسیر اور غلام رسول کی منظوم تفسیر سورۃ یوسف
مکمل ہوئی۔ ۱۳۲۶/۱۹۰۸ء میں غلام محمد غوث نے سورۃ فاتحہ کی تفسیر لکھی
اور عبدالجلیل نعمانی نے تفسیر الفوز العظیم لکھی۔

دوسرے سال مولوی انشاء اللہ کی تفسیر القرآن آٹھ جلدوں میں
شائع ہونا شروع ہوئی اور دس سال میں مکمل ہوئی۔ یہ رشید رضا مصری
کی تفسیر المنار کا اردو ترجمہ ہے۔ ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۲ء میں مولانا احمد رضا
خان کے ترجمہ قرآن پر مولوی نعیم الدین مراد آبادی نے حواشی تفسیر شائع
کیے۔ دوسرے سال حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی تفسیر مظہری (عربی)
کے ابتدائی تین پاروں کا اردو ترجمہ میرٹھ سے شائع ہوا اور حکیم
احمد علی خان کی اسرار القرآن (پارہ اول) شائع ہوئی۔ ۱۳۳۴ھ

۱۹۱۵ء میں محمد سعید قادری کی تفسیر واضح القرآن آگرہ سے شائع ہوئی۔ دو
دوسرے سال شاہ عبدالعزیز کی تفسیر فتح القدیر شائع ہوئی اور پھر ظہور الدین
اکمل کی معارف القرآن، شائق احمد عثمانی کی تفسیر القرآن اور غلام محمد
روح الایمان شائع ہوئی۔ ۱۳۳۹ھ/۱۹۶۰ء میں قاضی محمد سلیمان منصور
پوری نے تفسیر سورۃ یوسف لکھی۔ اسی سال آغا رفیق بلند شہری کی جواہر
القرآن (امام غزالی کی تفسیر کا ترجمہ) اور امیر علی کی مواہب الرحمٰن شائع
ہوئی۔ ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۳ء میں محمد دہلوی کی تفسیر محمدی (ترجمہ ابن کثیر)،
شفق عماد پوری کی کنز المعانی (سورۃ فاتحہ) اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی
کے تفسیری مواعظ بھی شائع ہوئے۔ دوسرے سال خواجہ حسن نظامی کی
عام فہم تفسیر دہلی سے شائع ہوئی۔ ۱۳۴۵ھ/۱۹۲۶ء میں محمد اشرف علی
شمسی کی تفسیر لوامع البیان اور کئی جزوی تفسیریں شائع ہوئیں۔ دوسرے
سال جب دہلی سے ایک قرآن پاک شاہ رفیع الدینؒ اور مولانا اشرف علیؒ
کے ترجموں کے ساتھ شائع ہوا تو اس کے حواشی میں مولانا عبدالماجد دریابادی
نے تفسیر واضح البیان شائع کی اور مولانا حبیب احمد کیرانوی نے تفسیر حل
القرآن تھانہ بھون سے شائع کی۔ ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء میں عبدالرحمٰن بخاری
کی تفسیر سعیدی شائع ہوئی۔ اور اسی سال مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی
تفسیر کی تیسری جلد (سورۃ مومنون کے بعد کی) مکمل کی ہوگی لیکن صرف
پہلی دو جلدیں شائع ہو سکیں۔ ۱۳۵۱ھ۔۱۹۳۲ء میں ابو مصلح نے "بچوں
کی تفسیر" شائع کی اور دوسرے سال محمد یحییٰ کاندھلوی کی الکوکب الدری، رانی
بیگم کی تفسیر سورۂ یوسف، سید آغا حسن کی ذیل البیان وغیرہ شائع ہوئیں۔ اسی
زمانے میں مولوی احمد الدین امرتسری کی تفسیر بیان الناس، محمد ابراہیم جوناگڑھی
کی تفسیر محمدی (ابن کثیر کا ترجمہ) شائع ہوئی۔ ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء میں
مولانا قاسم نانوتوی کے پوتے محمد طاہر نے "تفسیر منظوم آیۂ کعبہ" شائع

۱۳۶۰ھ / ۱۹۴۱ء میں عبدالمجید قریشی کی پارہ اول کی تفسیر درس القرآن شائع ہوئی اور اسی سال غلام احمد پرویز کی معارف القرآن چار جلدوں میں موضوعاتی ترتیب کے ساتھ شائع ہوئی۔ ۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۴ء میں غلام اللہ کی تفسیر جواہر القرآن اور مفتی احمد یار خان کی تفسیر نعیمی کی پہلی جلد شائع ہوئی۔ ۱۳۶۶ھ / ۱۹۴۶ء میں غلام دستگیر رشید کی تفسیر قرآن (فاتحہ) اور دوسرے سال مولانا عبیداللہ سندھی[1] کی جنگ انقلاب (قتال) اور عنوان انقلاب (فتح) شائع ہوئی۔ دوسرے سال عبدالحق فاروقی کی تفسیر القرآن اور محمد حسین کی تسہیل الفرقان شائع ہوئی۔ ۱۳۷۱ھ / ۱۹۵۱ء میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن شایع ہوتی۔ یہ پہلی جلد تھی۔ اور بعد میں بقیہ جلدیں بھی شائع ہوگئیں اور مختلف زبانوں میں منتقل کی گئیں۔ دوسرے سال مولوی احمد حسن فاضل نے تفسیر جدید لکھی اور نور احمد اصح المطابع والوں نے ابن کثیر کا ترجمہ پانچ جلدوں میں شائع کیا۔ دوسرے سال محبوب رنگے ندی کی تفسیر القرآن (پارۂ اول منظوم) شائع ہوئی اور ۱۳۷۴ھ / ۱۹۵۴ء میں مولانا عبدالماجد دریا بادی کی تفسیر ماجد شائع ہونا شروع ہوئی اور ۱۳۸۲ھ / ۱۹۶۲ء میں مکمل ہوتی۔ اسی زمانے میں مولانا عبدالدائم جلالی نے مولانا ثناء اللہ پانی پتی کی عربی تفسیر مظہری کو اردو میں منتقل کیا۔ ۱۳۸۴ھ / ۱۹۶۴ء میں عبدالحی کی آسان تفسیر اور پیر کرم شاہ کی تفسیر ضیاء القرآن شائع ہوتی۔ ۱۳۸۶ھ / ۱۹۶۶ء میں مفتی اعجاز ولی خان کی تنویر القرآن، عابد القادری کی آسان تفسیر اور غلام وارث کی تبیان القرآن شائع ہوئی۔ دوسرے سال نصیر شاہ اور رفیع اللہ نے ابومسلم خراسانی کی تفسیر کا اردو ترجمہ شائع کیا۔ ۱۹۶۸ء میں ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی کی تفسیر فیوض القرآن اور مولانا سعد حسن خان ٹونکی

---

[1] مولانا سندھی کی "تفسیر المقام المحمود" (پارۂ عم) حیدر آباد سے ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی۔

کی تفسیر اعجاز القرآن کے دو پارے شائع ہوئے پھر مفتی محمد شفیع (م۔ ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء) کی تفسیر معارف القرآن (آٹھ جلدوں میں) شائع ہوئی۔ یہ ہے قرآنی تراجم و تفاسیر کا مختصر سا جائزہ۔ لغات القرآن اور دوسرے متعلقات پر بے شمار کتابیں ان کے علاوہ ہیں۔

تجوید و قراءت:-

قرآن پاک کے نزول کے ساتھ ہی اس کی تلاوت کے لیے صحیح مخارج اور صفات کو سمجھنا، وقوف کو پہچاننا اور نحو اور رسم وغیرہ کے قواعد کے مطابق قراءات مختلفہ کے ضوابط کو جاننا بھی ضروری ہوا۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے دوسری صدی ہجری سے بے شمار کتابیں لکھی جانے لگیں جو سب کی سب عربی میں ہیں۔ لیکن بعد میں دو بزرگوں یعنی علامہ شاطبی (المتوفی ۵۹۰ھ/۱۱۹۴ء) اور علامہ جزری (المتوفی ۸۳۳ھ/۱۴۲۹ء) کی کتابیں زیادہ مقبول ہوئیں اور برصغیر پاک و ہند میں بھی ان کتابوں کی شروح بکثرت تیار ہوئیں۔

جنگ آزادی کے زمانے میں قاری عبدالرحمٰن پانی پتی (المتوفی ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء) نے علامہ شاطبی کے قصیدہ رائیہ کی عربی شرح لکھی اور فارسی میں تحفہ نذریہ اور فیوض رحمانی لکھیں جن کا اردو ترجمہ مولانا رحیم الدین طرب دہلوی نے کیا اور قاری صاحب موصوف کے صاحبزادے قاری عبدالسلام نے شرح شاطبیہ لکھی۔ محمد حسن ہاتفی شاہجہان پوری نے ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء میں رموز القرآن لکھی اور مولانا رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) نے رد الطغیان فی اوقاف القرآن لکھی۔ شاہ کرامت علی جونپوری (المتوفی ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء) نے اردو میں شرح ہندی جزری لکھی۔

مکہ معظمہ میں مدرسۂ صولتیہ کے قاری عبداللہ مکی نے [illegible] تعلیم الوقف لکھی اور ان کے چھوٹے بھائی قاری عبدالرحمٰن مکی (المتوفی ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء) نے افضل الدرر اور فوائد مکیہ لکھی۔ مولانا اشرف علی تھانوی (المتوفی ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) نے (جو قاری عبداللہ مکی کے شاگرد تھے) تنشیط الطبع۔ وجوہ المثانی۔ جمال القرآن اور تجوید القرآن (منظوم) نیز یادگار حق القرآن (منظوم) لکھیں۔

قاری عبدالرحمٰن مکی کے مشہور شاگرد قاری ضیاء الدین احمد الہ آبادی (المتوفی ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۲ء) نے عربی میں خلاصۃ البیان لکھی اور اردو میں ضیاء القرءات لکھی جسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ انھوں نے قصیدۂ رائیہ (شاطبی) کی شرح بھی اردو میں لکھی۔ پھر ان کے شاگردوں نے یہ تصانیف یادگار چھوڑیں:

(۱) قاری عنایت اللہ نے قراءات سبعہ کے ساتھ ایک قرآن پاک ساڈھورہ (ضلع انبالہ) سے شائع کیا۔

(۲) قاری محمد صدیق بنگالی نے شاطبیہ کی شرح اس کے حواشی میں لکھ کر شائع کی۔

(۳) قاری محمد نذیر لکھنوی، جو نابینا ہونے کے باوجود نظم القرآن فی رسم القرآن جیسی دانشمندانہ کتاب کے مصنف ہوئے۔

(۴) قاری عبداللہ مرادآبادی نے شرح طیبہ المعانی الجلیلہ اور سراج القراءت لکھیں۔

(۵) قاری محمد سلیمان دیوبندی [illegible] فی شرح [illegible] ضیاء التجوید اور رہنمائے تجوید الکبیر۔

(۶) قاری [illegible] قاری [illegible] احمد [illegible] نے اشعۃ الضیاء [illegible] ضیاء المرسلہ اور شروحات شاطبیہ وجزریہ وتحفۃ الاطفال [illegible]

مبتدیوں کی تجوید لکھی ۔

(۷) قاری عبدالمالک علی گڑھی نے قاری ضیاء الدین احمد سے شاطبیہ تک تعلیم حاصل کی بعد میں دوسرے بزرگوں سے مستفیض ہوئے۔ انھوں نے تعلیقات مالکیہ لکھی ۔

قاری ضیاء الدین احمد کے چھوٹے صاحبزادے قاری محب الدین احمد نے تحفۃ المبتدی ۔ معرفۃ التجوید ۔ معرفۃ الوقوف ۔ جامع الوقف ۔ جواہر مرضیہ ۔ تنویر القراءت وغیرہ متعدد کتابیں لکھیں ۔

ان کے علاوہ قاری ہادی حسن بھوپالی کی ہدایت القراء ، قاری محمد علی جلال آبادی کی منہاج التجوید ، شیخ محمد رفیق کی مفتاح القرآن (منظوم) رحیم بخش پانی پتی کی شرح تیسیر (ابو عمرو دانی کی تیسیر کی شرح) قاری محی الاسلام پانی پتی کی شرح سبعہ بڑی خصوصیت رکھتی ہیں اور اس دور کے سب سے مشہور قاری جو گو کہ نابینا ہیں یعنی قاری فتح محمد پانی پتی[له] نے اردو میں مایۂ ناز کتابیں لکھی ہیں :۔

(۱) شرح شاطبیہ (عنایات رحمانی) تین جلدوں میں ۔

(۲) علامہ شاطبی کے قصیدۂ رائیہ کی شرح ۔

(۳) علامہ جزری کے قصیدہ درۃ المضیئۃ کی شرح ۔

(۴) قاری رحیم بخش کی شرح تیسیر کی تصحیح اور اضافہ

ان بزرگوں کے علاوہ دوسرے قراء کی بھی بکثرت کتابیں ہیں جو ان کے طول و عرض میں پڑھائی جاتی ہیں ۔

حدیث :۔

برصغیر پاک و ہند میں صحابہ کرام رض کے بعد تابعین رح میں سے غالباً

له تجوید و قراءت سے متعلق یہ معلومات قاری فتح محمد صاحب ہی کے مقدمۂ شرح شاطبیہ (جلد اول) سے ماخوذ ہیں ۔

ربیع بن صبیح السعدی البصری پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے ۹۳ھ/۷۱۱ء میں یہاں قدم رنجہ فرمایا۔ اور وہی اسلام میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے بقول صاحب کشف الظنون (میزان الاعتدال۔ ج ا ص ۲۰۸) احادیث کو یکجا کرنے میں سعی فرمائی۔ تابعین میں سے حباب بن نضالہ اور اسرائیل بن موسیٰ بھی یہاں تشریف لائے۔ دوسری صدی ہجری کے ائمہ حدیث و سیر میں ابو معشر نجیح سندھی اور رجا سندھی کا شمار ہوتا ہے۔ ان بزرگوں کی وجہ سے جب ابلاغ و اتباع حدیث کا چرچا ہوا تو اصول حدیث، اسناد حدیث، تخریجات، رجال، شروح، مدونات، اوراد وغیرہ علوم بھی عام ہوئے۔ چنانچہ متقدمین سے لے کر متاخرین تک ہر دور میں اس سلسلے کی کتابیں لکھی گیئں۔

یترھویں صدی ہجری میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحؔ (م۔ ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحؔ (م۔ ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) کے نواسے یعنی محمد اسحٰق دہلوی (م۔ ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۶ء) نے مشکوٰۃ کا اردو ترجمہ کیا تھا لیکن ان کے فاضل شاگرد نواب قطب الدین دہلوی نے اس کی شرح لکھی اور ان کے استاد نے بھی بعض فوائد شامل کیے اور اس شرح کو "مظاہر حق" تاریخی نام (۱۲۵۴ھ) دے کر شائع کیا۔ نواب موصوف نے حصن حصین کا اردو ترجمہ بھی "مظفر جلیل" تاریخی نام (۱۲۵۳ھ) دے کر مرتب کیا۔ اسی زمانے میں مولانا خرم علی بلہوری (م۔ ۱۲۶۰ھ/ ۱۸۴۴ء) نے مشارق الانوار کا اردو ترجمہ تحفۃ الاخیار مرتب کیا۔ (مشکوٰۃ شریف کے اردو ترجمے ۱۲۰۰ھ سے لے کر ۱۲۸۷ھ تک کئی تیار ہوئے لیکن مظاہر حق کی مقبولیت آج بھی ہے)۔

اب ہم مختلف ترجموں کا ایک اجمالی جائزہ لینے

حدیث قدسی از محمد عمر (... دہلی ۱۸۶۰ء)
ہیں۔ مشکوٰۃ ... از ...
تحقیق الایوان فی تحفۃ الاخوان (مترجم نامعلوم)
(۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء)۔ احادیث قدسی از مقرب علی (۱۲۸۴ھ /
(۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء) ۱۸۶۵ء)۔
سراج السالکین از مولوی منیر (۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء)
۱۸۶۷ء)۔ بلوغ المرام
تحفۃ الاتقیاء از عبدالاحد (۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء)۔
(ابن حجر عسقلانی) مترجم نامعلوم (۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء) بلاغ مبین
از محی الدین و افضل بیگ (۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء)۔ فیض الباری از
نظام الدین حسن ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۱ء، ہدیۃ الحرمین از عبدالحکیم (۱۲۹۷ھ/
۱۸۸۱ء)۔ ضمیمہ فیض الباری از عبدالحی (۱۲۹۸ھ/۱۸۸۲ء) جائزہ
الشعوذی و ترجمہ ترمذی از بدیع الزمان (۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء)
سنن دارمی ترجمہ از مرزا حیرت دہلوی (۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء)۔
(مرزا حیرت دہلوی اور ان کے رفقاء نے مشکوٰۃ شریف اور صحیح بخاری
کا ترجمہ بھی اسی زمانے میں کیا تھا)۔ سنن ابی داؤد ترجمہ از بدیع
الزمان (۱۳۰۱ھ/۱۸۸۴ء)۔ فضل الباری از فضل احمد سیالکوٹی
(۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء)۔ الابواب والتراجم از شیخ الہند محمود حسن
(۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء)۔ تقدیم فی احادیث النبی الکریمؐ (۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء)
غرائب البیان از صفدر حسین (۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء) نواب وحید الزمان
(۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء) نے اسی زمانے میں صحیح البخاری، صحیح المسلم، سنن

۱؎ اسی زمانے میں عبدالاول امرتسری (م۔ ۱۳۱۳ھ) نے نووی کی ریاض
الصالحین اور مشکوٰۃ کے ترجمے کیے تھے اور مولانا فضل حق دلاوری نے شوکانی
(م۔ ۱۲۵۵ھ) کی الفوائد المجموعہ فی الاحادیث الموضوعہ اور ملا علی قاری
کی الموضوعات الکبیر کے اردو ترجمے کیے تھے۔ عبدالاول امرتسری نے
نصر الباری (ترجمہ بخاری) بھی شائع کی۔ نواب صدیق حسن خان (م۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ابن ماجہ، سنن ابی داؤد، موطائے امام مالک وغیرہ کے اردو ترجمے شائع کیے۔ فیض الباری از محی الدین خان دہلوی[1] (۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء) ترجمہ موطائے امام محمد از الہ داد (۱۸۹۰ء) ۔ کنز الاخلاق از عبد الرحمن (۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء)۔ کاشف اسرار از مشتاق احمد (۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء) ازالۃ الخفاء (شاہ ولی اللہ) ترجمہ از حبیب اللہ (۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء) مسند ابی حنیفہ از حبیب الرحمن سہارنپوری (۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء) تلخیص الصحاح ترجمہ از عبد الاحد (۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء) ۔ وصیتہ النبی ۔ ترجمہ از عبد الاحد (۱۹۰۵ء) ۔ توفیق الباری[1] (ترجمہ ادب المفرد امام بخاری) مترجم نامعلوم (۱۹۰۵ء) ۔ حدیث ابن سلام از محی الدین خان (۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء)۔ تلخیص الصحاح از محی الدین خان (۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء) ۔ الاعمال الماثورہ از سبحان بخش (۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء)۔ لمعات الاسلام از نواب محمد اسماعیل خان (۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء) ۔ ازالۃ الخفاء ۔ ترجمہ از عبد الشکور فاروقی (۱۳۳۷ھ/۱۹۱۸ء)۔ شمائل ترمذی، ترجمہ از عبد الشکور فاروقی (۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء)۔ تجرید البخاری[2] ترجمہ از فیروز الدین (۱۳۴۱ھ/۱۹۲۲ء) ۔ تجرید البخاری، ترجمہ از محمد حیات (۱۳۴۴ھ/۱۹۲۵ء)۔ مشکوٰۃ المصابیح، ترجمہ از شیخ خرم (۱۳۴۸ھ/

---

[1] الادب المفرد کا ترجمہ مولانا عبد القدوس ہاشمی نے بھی کیا ہے۔

[2] تجرید البخاری کا اردو ترجمہ مولانا ابو الفتح صغیر الدین نے بھی کیا ہے۔

(گزشتہ سے پیوستہ) (۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء) نے المفرد للبخاری ۔ ابو القاسم بنارسی نے حل مشکلات بخاری ۔ فضل حق دلاوری نے ترجمہ جامع الترمذی ۔ عبد العزیز فرخ آبادی نے شرح صحاح ستہ ۔ سید اولاد حسن قنوجی نے شرح چہل حدیث ۔ عبد الحمید سوہدروی نے زبدۃ المرام ۔ نواب صغیر الدین نے الامام الباری کا اردو میں منتقل کی ہیں۔ نواب صدیق حسن کی کتابوں کی ایک طویل فہرست ہے جو اس مضمون کی وسعت سے باہر ہے۔

۱۹۲۹ء)۔ تعطیر المشام (ترجمہ بلوغ المرام) از محمد حیات سنبھلی (۱۳۴۹ھ/
۱۹۳۰ء)۔ پیغام رسولؐ از کامل جونا گڑھی (۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء)۔
اتباع السُّنّہ از قادر علی (۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء)۔ انتخاب صحاح ستہ
از نیاز علی (۱۹۳۳ء)۔ ترجمہ خصائص نسائی از ابوالحسن (۱۳۵۴ھ/
۱۹۳۵ء) انوار محمدی از کرامت علی جونپوری (م۔ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء)
میں شائع ہوئی۔ ماثبت من السنہ (عبدالحق محدث دہلوی) ترجمہ از
برکت اللہ رضا لکھنوی (۱۹۴۳ء) ترجمہ سنن ابی داؤد از عبدالاول
(۱۹۵۰ء)۔ رحمۃ القدوس از ظفر احمد (۱۹۵۴ء)۔ مسلم مترجم از عبدالاحد
(۱۹۵۵ء)۔ ریاض السُّنّۃ از شاہ محمد جعفر ندوی (۱۹۵۶ء)۔ معارف الحدیث۔
(دو جلد) از محمد منظور نعمانی (۱۹۵۶ء)۔ ترجمان السُّنّہ (تین جلد)
از مولانا بدر عالم (۱۹۵۴ء تا ۱۹۵۷ء)۔ اسی زمانے میں مولانا ابو
الفتح صغیر الدین نے (۱) صحیح بخاری کا ترجمہ (تین جلد) (۲) تجرید بخاری
(حسین بن مبارک زبیدی) اور (۳) کتاب الآثار امام محمد کے ترجمے شائع
کیے۔ پھر مسند امام اعظم، ترجمہ از مولانا سعد حسن خاں (۱۹۵۶ء)۔
مکالمات نبویؐ از مولانا ابو یحییٰ امام نوشہروی (المتوفی ۱۹۶۷ء)۔
نصرۃ الباری شرح صحیح بخاری از مولانا عبدالستار دہلوی (المتوفی ۱۹۶۶ء)
فضل الباری (اردو شرح صحیح بخاری) از مولانا شبیر احمد عثمانی (المتوفی
۱۹۴۹ء)۔ حصہ اول ۱۹۷۳ء۔ حصہ دوم ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئیں [1]
ان کے علاوہ موجودہ دور میں بھی چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں حدیث سے
متعلق برابر شائع ہو رہی ہیں۔ [2]

---

[1] یہ دونوں حصے ادارۂ علوم شرعیہ کراچی نے شائع کیے ہیں بلکہ پہلے حصے کا
انگریزی ترجمہ بھی اس ادارے نے ۱۹۷۵ء میں شائع کر دیا ہے۔

[2] حدیث کے رجال، تاریخ اور متعلقات پر بھی بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔

فقہ:-

فقہ اور اس کے متعلقات - پر بلا مبالغہ چھوٹی بڑی ہزاروں کتابیں[1] لکھی گئی ہیں اور برابر لکھی جا رہی ہیں بلکہ نظم میں بھی ان کتابوں کی کمی نہیں۔ مثلاً پند نامہ (قلمی ۱۰۰۰ھ)۔ اساس المصلی از اشتیاق[2] (قلمی ۱۰۰۴ھ)۔ تحفۃ النصائح از قطبی رازی (قلمی ۱۰۳۵ھ)۔ فقہ ہندی از امین عبدی[3] (۱۰۴۴ھ) مسائل فقہ از شاہ ملک (قلمی ۱۰۷۷ھ)۔ ہزار مسائل از محمد علی (قلمی ۱۱۰۵ھ) ہدایت ہندی از شیخ داؤد ضعیفی (قلمی ۱۱۰۰ھ)۔ فقہ اسلام از سید محمد سالک (قلمی ۱۱۳۲ھ)۔ فقہ اسلام از محمد سعید (قلمی ۱۱۳۴ھ)۔ نسخۂ دل پذیر از حافظ غلام مصطفیٰ (قلمی ۱۱۴۱ھ)۔ کشف الخلاصہ از شجاع الدین (قلمی

(حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ)

موجودہ دور میں مصطفیٰ سباعی کی عربی کتاب السنۃ و مکانتہا کا اردو ترجمہ مولانا محمد حسن ٹونکی نے کیا ہے۔ پہلی جلد ۱۹۷۱ء میں اور دوسری ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی ہے۔ اسی طرح نیشاپوری (المتوفی ۴۰۵ھ) کی "معرفۃ علوم الحدیث" کا اردو ترجمہ محمد جعفر شاہ پھلواری نے لاہور سے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا ہے۔ اس میں علم حدیث کی باون اقسام کا جائزہ ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی کی تدوین حدیث، مولانا عبدالقیوم ندوی کی فہم حدیث، ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی کی تاریخ تدوین حدیث اور رسالہ ترجمان القرآن "منصب رسالت" نمبر بھی اہم تحریریں ہیں۔

[1] صرف قاموس الکتب (کراچی ۱۹۶۱ء) کی پہلی جلد میں تقریباً تین ہزار فقہی کتابوں کے نام ملتے ہیں۔

[2] دیکھیں راقم الحروف کی کتاب علمی نقوش (کراچی، ۱۹۵۷ء) صفحہ ۳۳، ۳۴

[3] تفصیل کے لیے دیکھیں راقم الحروف کی ... تحریر دکنی تعمیر حیدرآباد (۱۹۶۲ء) صفحہ ۳۶، ۵۶۔

۱۱۵۷ھ)۔ فقہ مبین از تیمن دکنی (قلمی ۱۱۸۲ھ)۔ دین دیپک از محمد علی الفت (قلمی ۱۱۹۴ھ)۔ کلامِ نبی[2] از غلام نبی (قلمی در دارالمطالعہ، مدینہ منورہ، ۱۲۰۵ھ)۔ فقہ منظوم از عزیز اللہ بیرنگ (قلمی ۱۲۲۵ھ)۔ نصیحت المسلمین از خرم علی (قلمی ۱۲۳۸ھ)۔ تصنیف رنگین از سعادت یار خان رنگین[1] (م۔ ۱۲۵۱ھ) نور الہدیٰ از سید محمد حیات (قلمی ۱۲۵۰ھ) فقہ اعظم از افضل (قلمی ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۶ء)۔ یہ منظوم رسالے اور کتابیں ۱۸۵۷ء سے پہلے کی ہیں اور اس کے بعد منظوم رسالے بہت کم نظر آتے ہیں۔ مثلاً کنز المصلی از قادر علی کمتر (قلمی ۱۲۹۰ھ)۔ رسالۂ بے نمازاں از رحیم بخش (قلمی ۱۳۰۰ھ)۔ حدیقۃ الایمان از نیاز حسین (مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۳۰۳ھ)۔ عقائد جامی رحمۃ اللہ ترجمہ از جمال الدین مفتی (مطبوعہ مدراس ۱۳۱۸ھ)۔ حبیب الفقہ از ولی اللہ مبارک پوری (مطبوعہ کانپور ۱۳۳۶ھ) کشف الخلاصۂ ہندی از حبیب علی (مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۳۴۸ھ)۔ عقائد منظوم از محمد قاسم (مطبوعہ بمبئی ۱۳۶۲ھ)۔

اب ۱۸۵۷ء کے بعد کی بعض نثری کتابیں ملاحظہ ہوں:

آبِ حیات از مفتی عبدالغفور (۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء)۔ ہدیۃ الانام از تراب علی لکھنوی (م۔ ۱۲۸۱ھ/ ۱۸۶۴ء)۔ لوح محفوظ از اثر (۱۲۸۲ھ/ ۱۸۶۵ء)۔ رسالۂ جمعہ از جان محمد (۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء)۔ راہ نجات از حافظ محمد علی پانی پتی (۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء)۔ مجمع الحسنات از حاجی محمد (۱۲۸۷ھ/ ۱۸۷۰ء)۔ احکام قربانی و صدقہ از جعفر علی (۱۲۸۸ھ/ ۱۸۷۱ء)۔ حیرت الفقہ از احمد بن وحید (۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء)۔ ارشاد العباد از احمد مشتاق (۱۲۹۱ھ/ ۱۸۷۴ء)۔ الدلیل القوی

---

[1] تصنیف رنگین کا قلمی نسخہ راقم الحروف کے پاس ہے۔ یہ حنفی فقہ سے متعلق ہے۔ [2] بقیہ کتابوں کے نام انجمن ترقی اردو، کراچی اور پنجاب یونیورسٹی (بالخصوص مجموعۂ شیرانی) کی فہرستوں میں آتے ہیں۔

از احمد علی سہارنپوری (م ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء)۔ تعلیم الطہارت از ابو تراب (۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء)۔ احکام الائمۃ از حسین علی (۱۲۹۸ھ/ ۱۸۸۱ء)۔ غایۃ الاوطار، ترجمہ دُرّالمختار از احسان اللہ (۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۶ء)۔ ترجمہ فتاویٰ عالمگیری از احتشام الدین و امیر علی (۱۸۸۹ء) عین الهدایہ (ترجمہ ہدایہ) از امیر علی (لیکن اس کا ۱۹۰۹ء کا ایڈیشن ملتا ہے)۔ رسالۂ نافع خریداران مع کشف المکنون از مولوی احمد (۱۳۰۹ھ/ ۱۸۹۲ء)۔ فقہ محمدی از ابوالحسن موسوی (۱۳۰۹ھ/ ۱۸۹۲ء)۔ وصاف الرجیح فی بسملۃ التراویح از مولانا احمد رضاخان[1] (۱۳۱۲ھ/ ۱۸۹۴ء)۔ مخزن طہارت از ابوالحسن الحسنی (۱۳۱۳ھ/ ۱۸۹۵ء)۔ منظار الکلام از اسد علی (۱۳۱۳ھ/ ۱۸۹۵ء)۔ تائید حق از حسین علی (۱۸۹۷ء)۔ بہشتی زیور از مولانا اشرف علی تھانوی[2] (۱۳۲۱ھ/ ۱۹۰۳ء)۔ طرز الحیات فی قصاص الجنایات از تراب بن شاہ حسین (۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۴ء)۔ مائۃ مسائل از احمد اللہ (۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء) ارکان اسلام از ابو محمد عبداللہ (۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء)۔ اصلاح الرجال از انعام اللہ کانپوری (۱۳۳۰ھ/ ۱۹۱۲ء)۔ نصاب الفقہ از مولوی بارک اللہ (۱۳۳۰ھ/ ۱۹۱۲ء)۔ ذخیرۂ آخرت

---

[1] مولانا احمد رضا خان نے فقہ پر ۲۱۴ اور مجموعی طور پر ۵۴۸ کتابیں لکھیں۔ دیکھیں رسالہ المیزان (بمبئی ۱۹۷۶ء)

[2] مولانا اشرف علی تھانوی نے بہشتی زیور کے دس حصے لکھے تھے اور مختلف علوم دینیہ پر ان کی آٹھ سو کتابیں ہیں۔ ان کے مواعظ بھی بکثرت ہیں جو رسالہ الابقاء (کراچی) میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ملتان سے مولانا عبدالرحمن نے ان مواعظ کی ایک درجن کتابیں شائع کی ہیں اور مولانا محمد مالک بھی تھدہ والدیار سے ان مواعظ کو شائع کر رہے ہیں۔

از حسینی بیگم (۱۹۲۲ء)۔ احسن المسائل ترجمہ کنز الدقائق[1] از امۃ اللہ
دہلوی (۱۳۴۵ھ/۱۹۲۶ء)۔ بہار شریعت از مولانا امجد علی (سترہ حصے
۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۸ء تک لکھے گئے۔)۔ فلاح دین و دنیا از انوار الحق
(۱۹۴۰ء)۔ الطہارت از بدر الدین جالندھری (۱۹۴۳ء)۔ القیام
از بدر الدین جالندھری (۱۹۴۳ء)۔ البیان المستطاب از عنایت اللہ
اثری (۱۹۴۶ء)۔ اسلامی قانون وراثت از غلام دستگیر (۱۹۴۹ء)۔
غیر مسلموں کے حقوق از مولانا امین اصلاحی (۱۹۵۰ء)۔ عدالت نبوی
کے فیصلے از عبد اللہ (۱۹۵۱ء)۔ فقہ عمر رضی اللہ عنہ از ابو یحییٰ
امام نوشہروی[2] (۱۹۵۲ء)۔ مسئلہ اجتہاد از محمد حنیف (۱۹۵۲ء)۔
مسئلہ سود از مفتی محمد شفیع (۱۹۵۴ء)۔ اسلام کا نظام حکومت[3]
از حامد انصاری (۱۹۵۶ء)۔ دین کی باتیں از احمد سعید دہلوی (۱۹۵۶ء)
حج کیا ہے؟ از حامد علی (۱۹۵۷ء)۔ القضایا از عنایت اللہ اثری
(۱۹۵۸ء)۔ سیاست شرعیہ از رئیس احمد جعفری (۱۹۵۹ء)۔ حقیقۃ الفقہ
از حافظ محمد انوار (۱۹۶۱ء)۔ تاریخ الفقہ از ظہور الحسن صارم (۱۹۶۴ء)

---

[1] کنز الدقائق، شرح وقایہ، ہدایہ، قدوری کے کئی ترجمے ملتے ہیں۔ مولانا محمد مالک نے بھی چند سال پہلے سراج الہدایہ (ترجمہ ہدایہ) شائع کی تھی۔ مولانا عبد الحی لکھنوی (المتوفی ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء) کی السعایۃ فی کشف ما فی شرح الوقایہ (شرح وقایہ کی شرح کبیر) اب پھر ۱۹۷۶ء میں شائع ہو گئی ہے۔

---

[2] ابو یحییٰ امام نوشہروی (المتوفی ۱۹۶۶ء) کی کتاب "ہندوستان میں اہل حدیث کی خدمات" (چیچہ وطنی ۱۹۷۱ء) کے صفحہ ۵۱ تا ۶۹ اور صفحہ ۱۹۵ تا ۲۲۰ میں بھی بکثرت فقہی کتابوں کے نام ملتے ہیں۔ [3] ڈاکٹر صبحی محمصانی نے فلسفۃ التشریع فی الاسلام لکھی تھی، اس کا اردو ترجمہ محمد احمد رضوی نے ۱۹۵۵ء میں لاہور سے شائع کیا اور "فلسفۂ شریعت اسلام" اس کا نام رکھا۔

عمدۃ الفقہ از مولانا زوار حسین (چار جلدیں ۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۷ء) زبدۃ الفقہ از مولانا زوار حسین (۱۹۷۵ء)۔ آسان فقہ از محمد یوسف اصلاحی (حصہ اول ۱۹۷۱ء حصہ دوم ۱۹۷۲ء)
ان کے علاوہ فتاویٰ عزیزی (شاہ عبد العزیز محدث دہلوی) فتاویٰ عبد الحی لکھنوی۔ فتاویٰ رشیدیہ (مولانا رشید احمد گنگوہی) امداد الفتاویٰ (مولانا اشرف علی تھانوی)۔ فتاویٰ رضویہ (مولانا احمد رضا خاں)۔ فتاویٰ دار العلوم (مفتی عزیز الرحمٰن و مفتی محمد شفیع)۔ احسن الفتاویٰ (مفتی رشید احمد)۔ فتاویٰ مظہریہ (مفتی مظہر اللہ دہلوی) وغیرہ بکثرت مجموعے ملتے ہیں۔ پھر مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا رکن الدین الوریٰ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولوی عبد الجلیل سورتی، مولوی ابو القاسم بنارسی، مولوی محمد دہلوی وغیرہ علماء کی بھی بکثرت کتابیں مختلف فقہی مسائل پر ملتی ہیں۔

سیرت طیبہ:

اللہ پاک کا ارشاد ہے: وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعٰلمین
اور ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام جہانوں کے لیے رحمت (بنا کر)

یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے میں اور ہر قوم نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات کا اعتراف کیا ہے اور چند مخالفوں کے علاوہ سبھی نے آپؐ کی سیرت طیبہ پر لکھنے کو بڑی سعادت سمجھا ہے۔ فن مغازی پر (جس میں سیرت طیبہ شامل ہے) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے نواسے حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ (م۔ ۹۴ھ) کی کتاب سب سے مقدم سمجھی جاتی ہے۔ پھر بکثرت تابعین رضی اللہ عنہم اور تبع تابعین رضی اللہ عنہم کی کتابیں وجود میں آئیں اور برصغیر پاک و ہند میں علمائے کرام کے ذریعہ اس فن کی اشاعت ہوتی رہی۔

اردو میں شمائل نامے، نور نامے، معراج نامے، وفات نامے،

اور میلادنامے وغیرہ سب سیرت طیبہ کے مختلف پہلو ہیں۔ متقدمین میں مختار کی مثنوی "مولود نامہ" ۱۰۹۰ھ/۱۶۷۹ء کی اور نبی الدین فناحی کی مثنوی مفید الیقین (یا مولود نامہ) ۱۰۹۵ھ/۱۶۸۴ء کی پائی گئی ہے۔ پھر ۱۱۰۰ھ/۱۶۸۸ء کے قریب شاکر کی مثنوی "مولود نامہ نبی" لکھی گئی۔[1] لیکن باقاعدہ اور مفصل سیرت کی مثنوی ولی ویلوری کی ہے جو روضۃ الانوار کے نام سے ۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء میں لکھی گئی۔[2] اس کے چند عنوانات یہ ہیں:

ذکر نور نبی، واقعات در مدت حمل، ذکر ولادت، شیر خوردن، سفر شام، خواستگاری خدیجہ رضی اللہ عنہا ابتدائے وحی، اسلام حمزہ رضی اللہ عنہ، اسلام عمر رضی اللہ عنہ ہجرت، وفات بی بی خدیجہؓ معراج ذکر معجزات، جنگ بدر، جنگ اُحد، جنگ احزاب، جنگ بنی قریظہ، جنگ تبوک، افک، فتح خیبر، فتح مکہ، جنگ حنین، فتح طائف، حجۃ الوداع وغیرہ پچاس سے زائد عنوانات ہیں۔

اس مثنوی کے بعد کئی مثنویاں اور کتابیں سیرت پر لکھی گئیں اور ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء میں مولوی صبغۃ اللہ نے (م۔ ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء) میں فوائد بدریہ لکھی جو ضخیم بھی ہے اور تمام تر احادیث کی مدد سے مرتب کی گئی ہے۔ یہ سب دکنی اردو سے متعلق ہیں اور شمالی ہند (پنجاب وغیرہ) کی تصانیف میں سے چند یہ ہیں:

محمد صدیق لاہوری (م۔ ۱۱۹۲ھ/۱۷۷۸ء) نے سلک الدرر

---

[1] نصیر الدین ہاشمی، "دکنی کے چند تحقیقی مضامین" دہلی ۱۹۶۳ء صفحہ ۲۳، ۲۶۔

[2] ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان "ولی ویلوری کی تین مثنویاں" رسالہ معارف اعظم گڑھ۔ جنوری ۱۹۴۰ء۔

(غیر منقوطہ سیرت النبیؐ) محمد مبین لکھنوی (۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) نے وسیلۃ النجاۃ، عبداللطیف قادری نے ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء میں ریاض سیر۔ عنایت احمد کاکوروی نے ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء میں تاریخ حبیب اللہ۔ غلام محمد ہادی خاں نے ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء میں سید الاخبار۔ محمد جان نے ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء میں اسرار احمدی۔ عبدالغنی نے ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء میں ضیاء الابصار اور اسی سال امانت علی نے تاریخ حال پیغمبرؐ لکھی۔ مولانا احمد رضا خاں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق گیارہ کتابیں لکھیں (یعنی ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء اور ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء کے درمیان) [1]

سرسید نے سر ولیم میور کے جواب میں خطبات احمدیہ لکھی جو پہلی بار ۱۸۸۷ء میں شائع ہوئی۔ دوسرے سال سرور علی نے "سوانح عمری حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم" لکھی۔ سر ٹامس آرنلڈ کی کتاب The Preaching of Islam کا اردو ترجمہ عنایت اللہ دہلوی نے "دعوت اسلام" کے نام سے کیا جو پہلی بار ۱۸۹۸ء میں شائع ہوا۔ عبدالعزیز لکھنوی نے ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء میں اخبار محمدی لکھی اور مرزا حیرت دہلوی نے ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء میں سیرۃ الرسولؐ لکھی۔ مولوی ابو خالد نے ۱۹۰۹ء میں "ہادی اعظم" اور مولوی محمد اسماعیل کاندھلوی نے قاضی عیاض کی الشفا کا ترجمہ ۱۹۱۳ء میں (جلد اول کا) اور ۱۹۱۴ء میں (جلد دوم کا)[2] کیا۔ مفتی انوار الحق نے ۱۳۳۶ھ/۱۹۱۸ء میں تذکرۃ

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں رسالہ المیزان (بمبئی ۱۹۷۶ء) صفحہ ۳۱۸، ۳۱۹۔

[2] تفصیل کے لیے دیکھیں "قاموس الکتب اردو (جلد اول) کراچی ۱۹۶۱ء۔ تذکرہ علمائے ہند (مرتبہ پروفیسر محمد ایوب قادری) میں بھی ضمناً بہت سی کتب سیرت کا ذکر آتا ہے۔

اور مفتی محمد شفیع نے ۱۹۲۵ء میں "ختم نبوت" (۳ حصے) لکھی۔ لیکن
اسی زمانے میں سیرت کی سب سے بڑی کتاب یعنی مولانا شبلی کی سیرۃ
النبیؐ ان کی وفات کے تقریباً چار سال بعد شائع ہوئی۔ ۱۳۳۶ھ/۱۹۱۸ء میں
ان کی پہلی جلد اور دو سال کے بعد دوسری جلد شائع ہوئی۔ پہلی جلد
کا مقدمہ جو فن روایت اور فن سیرت پر ہے ایک شاہکار کی حیثیت
رکھتا ہے اور اس جلد میں غزوات کی تفصیل آجاتی ہے۔ دوسری جلد
میں نبوت کی ۲۳ سالہ پر امن حیات طیبہ کی تفصیل ہے۔ کہیں کہیں تو میں
میں مولانا شبلی کے شاگرد مولانا سلیمان ندوی نے کچھ اضافے اور ترمیم
بھی کردی ہے اور اس سلسلے کی بقیہ چار جلدیں[1] اسی نابغۂ روزگار کی لکھی
ہوئی ہیں۔ مولانا شبلی نے شوال ۱۳۳۰ھ/ستمبر ۱۹۱۲ء کو پہلی جلد کا تمہ
اس طرح لکھا ہے:

"ایک گدائے بے نوا، شہنشاہِ کونینؐ کے دربار میں اخلاص وعقیدت
کی نذر لے کر آیا ہے۔

ع زچشم آستین بردار و گوہر را تماشا کن

پھر ظہور قدسی سے متعلق اس عقیدت سے لکھا ہے کہ فصاحت و
بلاغت میں کم از کم اردو ادب میں اس کا جواب نہیں۔ لکھتے ہیں:

"چمنستانِ دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں، چرخ نادرہ کار
نے کبھی کبھی بزم عالم اس سروسامانی سے سجائی کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔
لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیرکہن سال دہر نے کروڑوں
برس صرف کر دیے، سیارگانِ فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ
تھے۔ چرخ کہن، مدت ہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لیے لیل ونہار
کی کروٹیں بدل رہا تھا، کارکنانِ قضا و قدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی
جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں،

[1] "اب ساتویں جلد بھی چھپ گئی ہے۔"

عالمِ قدس کے انفاسِ پاک، توحیدِ ابراہیمؑ، جمالِ یوسفؑ، معجز طرازیِ موسیٰؑ، جاں نوازیِ مسیحؑ، سب اسی لیے تھے کہ یہ متاعہائے گراں ارز، شہنشاہِ کونینؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دربار میں کام آئیں گے۔

آج کی صبح وہی صبحِ جاں نواز، وہی ساعتِ ہمایوں فر، وہی دورِ فرخ فال ہے۔ اربابِ سیر اپنے محدود پیرایۂ بیان میں لکھتے ہیں کہ آج کی رات ایوانِ کسریٰ کے چودہ کنگرے گر گئے، آتش کدۂ فارس بجھ گیا، دریائے ساوہ خشک ہو گیا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ایوانِ کسریٰ نہیں، بلکہ شانِ عجم، شوکتِ روم، اوجِ چین کے قصرہائے فلک بوس گر پڑے۔ آتشِ فارس نہیں بلکہ جحیمِ شر، آتش کدۂ کفر، آذر کدۂ گمراہی سرد ہو کر رہ گئے۔ صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی۔ بتکدے خاک میں مل گئے۔ شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراقِ خزاں دیدہ ایک ایک کرکے جھڑ گئے۔ توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستانِ سعادت میں بہار آ گئی، آفتابِ ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاقِ انسانی کا آئینہ، پرتوِ قدس سے چمک اٹھا۔ یعنی یتیمِ عبداللہ، جگر گوشۂ آمنہ، شاہِ حرم، حکمرانِ عرب، فرماں روائے عالم، شہنشاہِ کونین...... عالمِ قدس سے عالمِ امکان میں تشریف فرمائے عزت و اجلال ہوا۔ "اللھم صل علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم"۔

مولانا شبلی کے نامور شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی نے اس سلسلے کو جاری رکھا۔ انھوں نے تیسری جلد معجزات پر، چوتھی عقائد پر، پانچویں عبادات پر اور چھٹی اخلاق پر لکھ کر دنیائے اسلام کے سامنے ایک ایسا شاہکار پیش کر دیا جو غالباً رہتی دنیا تک زندہ رہے گا۔ اسی کی مقبولیت کا اندازہ اسی بات سے ہو سکتا ہے کہ خود عربی زبان میں بھی اس کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ (فارسی اور انگریزی میں بھی)۔

کم و بیش انھی سنین میں مولانا سلیمان منصور پوری کی رحمۃ للعالمین

شائع ہوئی۔ اس کی تین جلدیں ہیں۔ پہلی جلد میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عام حالات اور تعلیمات درج ہیں۔ دوسری میں شجرۂ طیبہ سے لیکر حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمۃ للعالمینی شان پر تحقیق ہے اور تیسری جلد میں خصائص النبیؐ کی تفصیل ہے۔ ان کتابوں میں اسلام کا غیر مذاہب سے موازنہ و مقابلہ کیا گیا ہے اور ان کے اعتراضات کے جوابات بھی محققانہ انداز سے دیے گئے ہیں۔ ۱۹۳۰ء میں مولانا راشد الخیری نے "آمنہ کے لال" بچوں کے لیے سیرت کی کتاب لکھی اور غالباً اسی زمانے میں مولانا سلیمان ندوی کا ایک اور شاہکار "خطبات مدراس" شائع ہوا۔ یہ دراصل ان کے آٹھ خطبوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے سیرتِ طیبہ پر مدراس میں نومبر ۱۹۲۵ء میں دیے تھے۔ ان کے متعلق اجمالاً یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ خطبات ان کی کتاب "سیرۃ النبیؐ" کا خلاصہ ہیں اور یہ کہ مولانا کی علمی بقا کے لیے یہ خطبات ہی کافی ہیں۔

مولانا حکیم ابو البرکات عبدالرؤف دانا پوری نے ۱۹۳۲ء میں اصح السیر مرتب کی جو کراچی سے ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی۔ نہایت محققانہ کتاب ہے۔ اسی زمانے میں مولانا مناظر احسن گیلانی نے النبیؐ الخاتم لکھی جس میں واقعات کے بجائے "نتائج" پیش کیے ہیں اور ابتدا اس طرح کی ہے:

"یوں آنے کو تو سبھی آئے، سب ہی آئے، سب جگہ آئے کہ بڑی کٹھن گھڑیوں میں آئے لیکن کیا کیجیے کہ ان میں سے جو بھی آیا، جانے کے لیے آیا، پر ایک اور صرف ایک جو آیا وہ آنے ہی کے لیے آیا ہے، وہی جو اُبھرنے کے بعد پھر کبھی نہیں ڈوبا، چمکا اور چمکتا ہی چلا جارہا ہے۔"

مولانا کا بیان کس قدر والہانہ ہے۔[1]

اسی زمانے میں مولانا اشرف علی تھانوی نے حبیب خدا لکھی جو ان کے انتقال کے سات سال بعد ۱۹۴۹ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ ۱۹۳۹ء میں شاہ معین الدین ندوی کی تاریخ اسلام کا پہلا حصہ "عہد رسالت و خلافت راشدہ" پر مرتب ہوا اور غالباً اسی زمانے میں غلام رسول مہر کی کتاب سرور عالمؐ پہلی بار شائع ہوئی۔ مولانا یعقوب الرحمٰن کی کتاب پیغمبر انسانیت اور سید نواب علی کی "ہمارے نبیؐ" (بچوں کے لیے) بھی اسی زمانے کی ہیں۔ ۱۹۴۶ء میں سید احمد قادری نے حلیۃ النبیؐ لکھی۔ ۱۹۴۹ء میں سیماب اکبر آبادی نے سیرۃ النبویؐ اور اسی سال رئیس احمد جعفری نے "رسالت مآبؐ" لکھی۔ ۱۹۵۴ء میں مولوی اخلاق حسین قاسمی نے وفات النبیؐ لکھی (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری ایام پر محققانہ کتاب) لکھی اور دوسرے سال مولانا عبدالحی نے حیات طیبہ لکھی۔ ۱۹۵۹ء میں مولانا ظفر الدین نے "اسوۂ حسنہ" (جلد اول، لکھی) جس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صبر آزما زندگی کی تفصیل ہے۔ ۱۹۶۱ء میں مولانا محمد صادق سیالکوٹی نے "سید الکونین" اور دوسرے سال مولانا عبدالجلیل نے ابن ہشام[2] کا ترجمہ کیا۔ ۱۹۶۴ء میں محمد حسین ہیکل کی کتاب "حیاتِ محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) (عربی) کا اردو ترجمہ سیرۃ الرسولؐ شائع ہوا۔

---

[1] مولانا گیلانی کی "الدین القیم" بھی ایجاز کی ایک نادر مثال ہے۔

[2] ابن ہشام کے متعدد ترجمے اردو میں شائع ہوئے ہیں۔ مثلاً ۱۹۱۳ء میں کارخانہ وطن اخبار لاہور نے شائع کیا۔ عثمانیہ یونیورسٹی نے ۱۹۴۸ء میں بھی شائع کیا۔ عبدالرحیم اینڈ برادرس، لاہور نے بھی شائع کیا (سال اشاعت ندارد)

اس کے سر آغاز میں چودھری عبدالحمید لکھتے ہیں :
"مولانا انعام اللہ) ناصر مرحوم نے ترجمہ کرتے وقت صرف زندگانی محمدؐ (مترجم ابو القاسم پاینده) کو سامنے رکھا تھا اور اس کا مقابلہ حیات محمد (اصل عربی کتاب) کے ساتھ نہیں کیا تھا۔ مترجم نے اپنے ذاتی عقائد کے مطابق بعض مقامات پر تصرف کر دیا ہے۔۔۔۔"
اس وجہ سے چودھری صاحب موصوف نے اصل عربی کا ترجمہ مولانا محمد وارث کامل سے کرایا ہے۔

۱۹۶۶ء میں مولانا مقصود علی خیر آبادی نے ابن الاثیر کا ترجمہ (سیرت سے متعلق) شائع کیا۔ ۱۹۶۸ء میں شمس الحسن شمسی نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی مدارج النبوۃ کا ترجمہ شائع کیا۔ اسی زمانے میں مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی سیرۃ مصطفےٰ (مختلف سنین میں) چار جلدوں میں شائع ہوئی۔ ۱۹۶۹ء میں (۱) محمد عنایت اللہ اصلاحی کی محمد عربیؐ (۲) محمد حنیف یزدانی کی "محمد رسول اللہؐ۔ غیر مسلموں کی نظر میں" اور (۳) محمد اسماعیل کی رسول عربیؐ شائع ہوئی۔ دوسرے سال ہمدرد والوں نے مختلف علماء اور فضلاء کے مضامین جمع کر کے "تذکار محمدؐ" کے نام سے ایک مجموعہ شائع کیا۔ ۱۹۷۲ء میں مولانا یوسف بن اسماعیل کی شمائل رسولؐ شائع ہوئی۔ ۱۹۷۶ء میں خالد لطیف گابا کی انگریزی کتاب The Prophet of the Desert کا ترجمہ "پیغمبر صحرا" کے نام سے پروفیسر احمد الدین مارہروی نے رسالہ شاہکار (لاہور) کے ذریعہ سے شائع کیا۔ اس کے علاوہ بلا مبالغہ چھوٹی بڑی کتابیں سیکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں جن کا استقصار بھی بہت دشوار ہے۔[1]

---

[1] ڈاکٹر زبید احمد نے "عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ" (مترجم شاہد حسین رزاقی) میں برصغیر کے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے علاوہ مختلف بزرگان دین کے حالات پر بھی ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں جن کے مطالعہ سے ہماری قومی تاریخ کے بہت سے گوشے بے نقاب ہو سکتے ہیں۔

میلاد نامے:- حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق شمائل نامے، نور نامے، معراج نامے، وفات نامے اور میلاد نامے نظم ونثر دونوں میں متقدمین کے یہاں بھی خاصی تعداد میں ملتے ہیں لیکن متاخرین کے یہاں زیادہ تر میلاد نامے (مولود شریف) ملتے ہیں جن میں نظم ونثر دونوں کی آمیزش ہوتی ہے۔ حضرت شاہ احمد سعید دہلویؒ (م۔ ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء) نے جنگ آزادی کے زمانے میں دہلی سے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی تھی۔ انھوں نے ۱۲۵۰ھ ۱۸۳۴ء کے قریب سعید البیان لکھی تھی۔ اسی زمانے میں مولانا عبدالمجید بدایونی نے محافل الانوار فی احوال سید الابرار، مولانا محمد حیات نے احوال النبیؐ، شاہ محمد سلامت اللہ لکھنوی نے

(گزشتہ سے پیوستہ) ان مصنفین کا ذکر بھی کیا ہے جنھوں نے سیرت طیبہ پر عربی میں لکھا ہے۔ انگریزی میں لکھنے والے بھی کم نہیں، کارلائل، واشنگٹن ارونگ، اسپرنگر، ڈی لین، باسورتھ اسمتھ، مارگولیوتھ وغیرہ۔ ہندوؤں نے بھی اردو میں ایسی کتابیں لکھی ہیں جو پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں بھی موجود ہیں اور انجمن ترقی اردو (کراچی) کے کتب خانے میں بھی، آج کی کتابوں میں ڈاکٹر عبدالحی صاحب کی کتاب "اسوۂ رسول اکرمؐ" بھی امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب ابھی کراچی سے شائع ہوئی ہے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرتی زندگی سے متعلق ہے۔

"میلاد شریف" اور قربان علی بیگ سالک نے عشقِ مصطفےٰ وغیرہ لکھیں۔ سر سید نے ۱۲۵۸ھ / ۱۸۶۸ء میں جلاء القلوب بذکر المحبوب لکھی۔ مولانا عبد الحلیم فرنگی محلی (م ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء) نے (۱) نظم الدرر فی سلک شق القمر اور (۲) نور الایمان فی آثار حبیب الرحمٰن لکھی اور مولانا عبد الرزاق فرنگی محلی (م ۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ء) نے (۱) رسالہ میلاد النبیؐ اور (۲) تنشیط العشاق فی احوال النبیؐ المشتاق لکھی[۲] غلام امام شہید (م ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۹ء) نے (۱) خدا کی رحمت (۲) میلاد شریف شہید اور (۳) مولود شریف بہاریہ لکھی۔ مولانا حالی نے ۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۴ء میں "مولود شریف" عبد القادر نے دوسرے سال سودائے آخرت اور محمد وجیہ نے اسلامی مجالس لکھیں۔ مولوی حفاظت حسین نے ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۶ء میں میلاد النبیؐ اور دوسرے سال علی بہادر مرزا نے "مولود عرض بہادر" لکھی۔ باقر علی لکھنوی نے ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء میں "میلاد شریف" لکھی اور اسی سال فضل رسول نے "مولود منظوم" لکھی پھر ۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۳ء میں وزیر علی عاقل نے مظہر میلاد لکھی اور اسی زمانے میں امیر مینائی نے اپنے نعتیہ قصائد "محامد خاتم النبیینؐ" کے علاوہ ابرِ کرم اور خیابانِ آفرینش وغیرہ لکھیں۔ منور حسین بشیر نے "سرور بشیر"۔ محمد اسماعیل نے نور محمدی، محبوب اللہ نے میلاد و سوانح عمری محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ وحید الدین رضوی نے ریاض

---

[۱] رسالہ اردو ادب، علی گڑھ، شمارہ جولائی تا دسمبر ۱۹۵۴ء۔ صفحہ ۱۸۱ تا ۱۸۶ میں مزید تفصیل بھی مل سکے گی۔

[۲] دیکھیں مولانا رحمٰن علی کا تذکرۂ علمائے ہند (مرتبہ پروفیسر محمد ایوب قادری) کراچی ۱۹۶۱ء، صفحہ ۲۸۴، ۲۹۴۔ محمد عتیق صدیقی نے "صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات" کے صفحہ ۱۹۶ میں ایک وفات نامۂ پیغمبرؐ کا ذکر کیا ہے جو ۱۸۵۳ء میں مطبع مصطفائی دہلی سے شائع ہوا تھا۔

الازہار، جمیل احمد نے شمامۃ العنبریہ من مولود خیر البریہ، عبد اللہ مقبول احمدی نے میلادِ محمدی، عبد الحق الہ آبادی نے الدر المنتظم فی بیان الحکم عبد الحفیظ نے "فضائلِ محمدی" سراج الدین نے تاریخِ احمدی، سرور علی قاضی نے "میلادِ سرورؐ انبیاء" ناصر علی نے ناصر اللبیب فی اسماء الحبیب اور محسن الملک نے محفلِ میلاد لکھی۔ پھر مہدی علی پروانہ کی شمع لاہوت، محمد علی خان کی نبی نامہ، مظہر الاسلام کی مولود نامہ، انوار اللہ خان کی انوار احمدی، اور شاہ جہاں بیگم بھوپالی کی سیرِ مصطفےٰ، ۱۳۱۶ھ ۱۸۹۹ء اور ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء کے درمیان لکھی گئیں۔ احسن علی حسن کی احسن المیلاد اور مجید الدین کی میلادِ مجیدی ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء کی یادگار ہیں۔ حبیب اللہ نے "مولود سلطان الانبیاء" ۱۹۱۲ء میں اور عبد الوحید نے تذکرۃ الحق ۱۹۱۵ء میں شائع کی۔ دوسرے سال ابو البیان نے "سچا میلاد شریف" شائع کیا۔ پھر محمد جان شاہ کی میلاد النبیؐ (ترجمہ) وزیر حسین کی میلاد مصطفوی، تجمل حسین کی ذکرِ میلاد، مولانا اشرف علی تھانوی کی نشر الطیب اور طریقۂ میلاد، حنیف الدین کی سرچشمۂ رحمت، خواجہ حسن نظامی کی (۱) "محمدؐ کی سرکار" (۲) محمد درشن اور (۳) اسلامی رسول، حشمت علی کی اسوۂ حسنہ وغیرہ بھی اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۵ء کے درمیان خواجہ حافظ علی کی میلاد محمدیؐ تقی الدین چشتی کی فردوس تقی، حبیب حسین کی میلادِ حبیب، عبد الرزاق ملیح آبادی کی میلاد نامۂ جدید، محمد عظیم کی تحفۂ عثمانیہ، رحمٰن علی خان کی طریقۂ حسنہ، حامد علی کی محامد النبیؐ، عبد الحلیم شرر کی ولادتِ سرورِ عالمؐ، ابو الکلام آزاد کی ذکریٰ اور ذکر میلاد، ایم اسلم کی نورِ ہدایت اور یاور حسین کی میلادِ سرفرازی قابل ذکر ہیں۔ اس کے بعد مختلف سنین میں نواب حبیب الرحمٰن خان شروانی کی ذکرِ حبیبؐ، محمد ادریس

کاندھلوی کی ظہورِ خاتم الانبیاء، محمد مدنی کی سبحان المولود، محمد سعید کی مولودِ سعیدی، امداد علی کی سرورِ کائنات، عبدالسبحان کی میلاد النبی، عبدالرحمٰن نگرامی کی ذکرِ مبارک، محمد بن ابراہیم کی میلادِ محمدی، علم الدین نیرنگ کی اذکارِ جمیل، جلال الدین کی اعجازِ احمدی، مشیر مخدومی کی "حبیب خدا کی عیدی"، اکبر خان میرٹھی کی میلادِ اکبر، عبدالعلیم صدیقی کی ذکرِ حبیب، صادق حسین کی آفتابِ عالم، عبدالمجید کی پیغامِ رحمت وغیرہ سیکڑوں کتابیں لکھی گئیں اور برابر لکھی جا رہی ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔[1]

تصوف :-

دراصل صحیح تصوف "تزکیۂ نفس" ہے جو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اطاعت میں خلوص پیدا کراتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر وہ تصوف ہی نہیں۔ ؎ کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید۔

پاکستان میں غالباً حضرت علی بن عثمان "داتا گنج بخش" ہجویری (م۔ ۴۶۹ھ/۱۰۷۶ء) کی کتاب کشف المحجوب، تصوف کی پہلی کتاب ہے۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً بکثرت کتابیں اردو میں لکھی گئیں یا ترجمہ کی گئیں۔ جنگ آزادی کے بعد کی کتابوں میں سے کچھ کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے:-

نکات الواصلین از محی الدین (۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء) زبدۃ الاسرار از ابراہیم علی خان (۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء)۔ گلستان طریقت از عبدالرزاق (۱۸۶۳ء)۔ انوار معرفت از عبدالرحمٰن (۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء)۔ انوار العاشقین از حسین علی (۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء) ہدیۂ قادریہ از عبدالقادر (۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء)۔ گوہر مقصود از عبدالقدوس

---

[1] قاموس الکتب اردو (جلد اول) کراچی ۱۹۶۱ء میں ایسی سیکڑوں کتابوں کے نام ملتے ہیں اور ان کے ماخذوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اسی قاموس میں دیگر مذاہب کی ۵۴۸ کتابوں کا ذکر بھی ہے۔

(۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء)۔ مجموعۂ تصوف از احمد اختر فریدی (۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء)۔ تزکیۃ القلوب از عبدالکریم (۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء) ارشاد پیر از عبدالرب حنفی (۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء)۔ سرچشمۂ رحمت از حبیب الدین احمد (۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء)۔ خلاصۃ العلم والسلوک (ترجمۂ غزالی) از احمد علی (۱۸۸۱ء)۔ تنبیہ الغافلین از سید محمد (۱۸۸۳ء)۔ سراج الفقراء از امام الدین احمد (۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء)۔ تلاوت الوجود از عبدالکریم (۱۳۰۶ھ/۱۸۸۸ء)۔ نصیحت المریدین از عبدالمجید (۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء)۔ سرمایۂ سہاگن از عبدالخالق نقشبندی (۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء)۔ خزینۃ الفرقان از جمال الحق (۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء)۔ اقدام المحبوب از جمال الحق (۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء)۔ سبیل الرشاد از رشید احمد گنگوہی (۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء)۔ احسن الشواہد (ترجمۂ افضل الفوائد امیر خسروؒ)۔ از مولا بخش چشتی (۱۳۱۳ھ/۱۸۹۵ء) سراج المجالس (ترجمہ خیر المجالس) از احمد علی ٹونکی (۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء)۔ انیس الاشباح (ترجمہ مونس الارواح) از ابو سراج لکھنوی (۱۸۹۸ء)۔ آداب المریدین (مصنف نامعلوم) (۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء)۔ تقدیس النعیم از آل احمد نعیم (۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء)۔ گلزار فریدی از محمد حسین (۱۹۰۲ء)۔ برکات الاولیاء از امام الدین گلشن آبادی (۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء)۔ حالات مشائخ نقشبندیہ از محمد حسن (۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء)۔ کتاب الفقراء از حسین علی (۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء)۔ سوانح عمری غلام محی الدین برکی از غلام احمد خان جالندھری (۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء)۔ عزیز الآخرت از عبدالعزیز قادری (۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء)۔ اذکار ابرار از فضل الدین (۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء)۔ سوانح میاں وڈا از محمد شفیع (۱۹۰۹ء)۔ خلاصۃ العارفین (ملفوظات زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ)

مترجم نامعلوم (۱۹۰۹ء)۔ سلطان الاذکار فی مناقب غوث الابرار
از محمد علم الیقین (۱۳۳۰ھ/۱۹۱۲ء)۔ انوار العاشقین از مشتاق
احمد امیٹھوی (۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء)۔ انوار شمسیہ از امیر بخش
(۱۳۳۵ھ/۱۹۱۷ء)۔ تذکرۂ علماء و مشائخ لاہور از محمد دین فوق
(۱۹۲۰ء)۔ اسرار حق از الیاس برنی (۱۹۲۱ء)۔ ملا عبد الحکیم
سیالکوٹی رحمۃ اللہ از محمد دین فوق (۱۹۲۴ء)۔ روح جذبات از
احمد اللہ (۱۹۲۵ء)۔ تصوف اسلام از عبد الماجد دریابادی
(۱۹۲۵ء)۔ سوانح عمری حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ از ابو الفضل
احسان اللہ (۱۹۲۶ء)۔ سوانح حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ
از مفتی اجمیری (۱۹۲۷ء)۔ تذکرۂ کاملان رام پور از احمد علی خان
(۱۹۲۹ء)۔ احترام الاصفیاء از دین محمد (۱۹۳۱ء)۔ مناقب غوثیہ
(محمد غوث گوالیاری) مترجم نامعلوم (۱۹۳۳ء)۔ تذکرۃ الصالحین
(سوانح قاری عبد الرحمن پانی پتی)۔ از محمد عبد الحلیم انصاری (۱۹۳۸ء)
ذکر مبارک (اعیان مکان شریف) از قائم الدین (۱۹۴۰ء) خمسہ
قلندریہ از کاکوروی (۱۹۴۰ء)۔ عمدۃ السلوک مولانا زوار حسین
(۱۹۴۴ء)۔ راہِ سلوک از محمد طٰہٰ کمال ندوی (۱۹۴۷ء)۔ رسائلِ
تصوف از محمد آفاق شاہ (۱۹۴۹ء)۔ تاریخِ مشائخِ چشت از
خلیق احمد نظامی (۱۹۵۳ء)۔ حیات شیخ عبد الحق محدث دہلوی از
خلیق احمد نظامی (۱۹۵۳ء)۔ عین الولایت از عزیز اللہ شاہ (۱۹۵۳ء)
قرآن اور تصوف از میر ولی الدین (۱۹۵۶ء)۔ مآثر لاہوری از
ہاشمی فرید آبادی (۱۹۵۶ء)۔ (۱) تذکرہ حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی
(۲) شیخ صدر الدین عارف رحمہ اللہ (۳) شاہ رکن عالم ملتانی
رحمہ اللہ از نور احمد خان فریدی (۱۹۵۴ء تا ۱۹۶۱ء)۔ برہان پور

ے سندھی اولیاء از مطیع اللہ راشد (۱۹۵۷ء)۔ مرزا مظہر
اور ان کا کلام از عبدالرزاق قریشی (۱۹۶۰ء)۔ تاریخ جلیلہ از
غلام دستگیر نامی (۱۹۶۰ء)۔ خطوط مرزا مظہر رحمۃ اللہ علیہ از
خلیق انجم (۱۹۶۲ء)۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت رحمۃ اللہ علیہ از
محمد ایوب قادری (۱۹۶۳ء)۔ انوار الفریدیہ از مسلم نظامی (۱۹۶۵ء)
(۱) شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ (۲) تذکرہ صوفیائے پنجاب
(۳) تذکرہ صوفیائے سرحد (۴)۔ تذکرہ صوفیائے سندھ از
اعجاز الحق قدوسی (۱۹۶۱ء تا ۱۹۶۵ء)۔ بزرگان لاہور از غلام
دستگیر نامی (۱۹۶۶ء)۔ خواجہ بندہ نواز رحمۃ اللہ کا تصوف از
میر ولی الدین (۱۹۶۶ء)۔ تذکرہ اولیائے جھنگ از بلال زبیری
(۱۹۶۸ء)۔ ذکر جمیل از محمود عالم مفتی (۱۹۶۸ء)۔ مکتوبات صدی
(شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ) ترجمہ از شاہ نجم الدین فردوسی
(۱۹۶۸ء)۔ عبدالرحمٰن پاک نوشاہی از شرافت نوشاہی (۱۹۷۱ء)
انوار بندگی از شاہ محمد سراج عطا (۱۹۷۱ء)۔ احوال و آثار سید
شرافت نوشاہی از محمد اقبال مجددی (۱۹۷۱ء)۔ حضرت عبداللہ
"صحابی" ٹھٹھوی از امیر شاہ قادری (۱۹۷۱ء)۔ تذکرہ مشائخ قادریہ
حسینیہ از امیر شاہ قادری (۱۹۷۲ء)۔ اولیائے قصور از ڈاکٹر
محمد شفیع (۱۹۷۲ء)۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ از مولانا زوار
حسین (۱۹۷۲ء)۔ تذکرہ علماء و مشائخ سرحد (دو جلد) از امیر شاہ
قادری (۱۹۷۳ء)۔ تذکرہ شاہ بلاول قادری لاہوری از
اخلاق احمد (۱۹۷۵ء)۔ تذکرہ ہاشمیہ (سوانح ہاشم بھرپالوی)
از ابو ضیا ہاشمی (۱۹۷۵ء)۔ سلوک مجددی از ظہور الدین احمد
(۱۹۷۵ء)۔ انتخاب گنج شکر، مرتبہ شرف... نوشاہی (۱۹۷۵ء) تذکرہ

مشائخ قادریہ از محمد دین کلیم قادری (۱۹۷۵ء)۔ حدائقۃ الاولیاء از مفتی غلام سرور (تعلیقات از محمد اقبال مجددی) (۱۹۷۵ء) تذکرہ صوفیائے بلوچستان از انعام الحق کوثر (۱۹۷۶ء)۔ تجلیات ربانی از نسیم احمد امروہوی (۱۹۷۶ء)۔ سبیل الرشاد از خواجہ عبدالاحد گلشن نبیرہ رحمۃ اللہ (۱۹۷۷ء)۔ مکتوبات امام ربانی رحمۃ اللہ کی دینی اور معاشی اہمیت از ڈاکٹر سراج احمد خان[1] وغیرہ وغیرہ۔

نعتیہ شاعری: سورۃ الانشراح میں ہے: ورفعنا لک ذکرک (اور ہم نے بلند کیا آپؐ کے لیے آپؐ کا ذکر)۔

یہی وجہ ہے کہ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں پوری دنیا کے کسی نہ کسی گوشے میں اذان ہوتی رہتی ہے اور اللہ کے ساتھ (اذان اور غیر اذان میں بھی) برابر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بھی ہوتا رہتا ہے بلکہ ایک مسلمان کے جینے سے مرنے تک تمام مراحل انھی دو یادوں سے وابستہ ہیں۔ آپؐ کی ذات گرامی میں جمال، کمال اور نوال تینوں کی خوبیاں تمام وکمال موجود تھیں، اس لیے دشمنوں نے

---

[1] راقم الحروف کو بھی تصوف کی چھوٹی بڑی ۳۵ کتابوں کے شائع کرنے کی سعادت حاصل ہوتی ہے لیکن وہ کچھ عربی کی اور اکثر فارسی کی ہیں۔ جو کتابیں یا رسالے مع اردو شائع ہوئے ان کے نام یہ ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ کی (۱) اثبات النبوۃ (۲) رسالۂ تہلیلیہ (۳) مکاشفات عینیہ (۴) رسالہ در فضائل صحابہؓ۔ خواجہ عبدالاحد گلشن رحمۃ اللہ، سبیل الرشاد۔ بدرالدین سرہندی رحمۃ اللہ، وصال احمدی۔ شاہ عبدالرحیم (پدر شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ)، ارشاد رحیمیہ۔ شاہ ابو سعید دہلویؒ ہدایت الطالبین۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ (تحقیقی جائزہ)

بھی آپؐ کو صادق اور امین کہا اور مسلمانوں نے اپنی دنیا اور آخرت کی فلاح کے لیے صرف آپ کی غلامی اور محبت کو سہارا جانا۔ چنانچہ ہر دور میں آپؐ کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کرنا بڑی سعادت سمجھا گیا۔ کیوں کہ بقول علامہ اقبال:

قوتِ قلب و جگر گردد نبیؐ — از خدا محبوب تر گردد نبیؐ

اردو شعراء میں ولی دکنی (م۔ ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء)، قاضی محمود بحری (م۔ ۱۱۲۹ھ/۱۷۱۷ء)، مرزا سودا (م۔ ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۰ء)، خواجہ میر درد (م۔ ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء)، میر تقی میر (م۔ ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) نظیر اکبر آبادی (۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء)، کرامت علی شہیدی[1] (م۔ ۱۲۵۶ھ/۱۸۴۰ء)، مومن دہلوی (م۔ ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء)، ذوق دہلوی (م۔ ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء)، بہادر شاہ ظفر (م۔ ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء) وغیرہ میں سے کتنے ہیں جنھوں نے کئی کئی نعتیں لکھیں۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ (م۔ ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء) لکھتے ہیں:

خدا نے ذاتِ احمدؐ کو وہ اعلیٰ مرتبہ بخشا
کہ دم بھرتے ہیں ہر دم حضرت عیسیٰؑ، محمدؐ کا
ملائک نے کیا تھا اس سبب سے سجدہ آدمؑ کو
کہ پیشانی سے ان کی، نور تھا پیدا محمدؐ کا

غلام امام شہید امیٹھوی (م۔ ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء) کہتے ہیں:

---

[1] شہیدی جنگِ آزادی (۱۸۵۷ء) سے پہلے کے ہیں لیکن ان کے اس ذکر کے بغیر یہ مضمون مکمل نہیں معلوم ہوتا کہ انھوں نے ایک قصیدہ لکھا تھا جس کا ایک شعر یہ تھا۔

تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھے — قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مقید کا

خوش نصیبی ہوئی کہ ۱۲۵۶ھ میں حج کے بعد روضۂ اقدس کو دیکھتے ہی طائرِ روح کا قفس ٹوٹ گیا۔ شہیدی کے معاصرین میں مولانا عبدالکافی مرادآبادی اور کفایت علی کافی بھی مشہور نعت گو تھے۔

سینہ ہے مرا دکش صحرائے مدینہ
دل ہے جرس محمل لیلائے مدینہ
ہر سنگ میں واں کے شرر طور ہے پنہاں
ہر خشت کو کہیے ید بیضائے مدینہ
قسمت یہ دکھاتی ہے کہ حسرت کی نظر سے
ہم دیکھتے ہیں اس کو جو دیکھ آئے مدینہ

مولانا قاسم نانوتوی (م - ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) کے اشعار ہیں :۔

تو بوئے گل ہے اگر مثل گل ہیں اور نبیؐ
تو نور شمس ہے گر دوسرے ہیں شمس نہار
حیات روح ہے تو، ہیں اگر وہ جان جہان
تو نور دیدہ ہے گر ہیں وہ نور دیدۂ یار
جہاں کے سارے کمالات ایک تجھ میں ہیں
ترے کمال کسی میں نہیں مگر دو چار

لطف علی خان لطف بریلوی (م - ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء) اس طرح عرض کرتے ہیں :

سہارا ہے ہر دوسرا میں ترا نہیں دوسرا یا شفیع الوریٰ
مجھے بھول جانا نہ بہر خدا بروز جزا یا شفیع الوریٰ

عبدالغفور نساخ عظیم آبادی (م - ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۸ء) کہتے ہیں:

سید کونین ، ختم المرسلینؐ   دور آخر میں ہے فخر الاولیں
طے ہو جس کی معراج میں راہ سما   کیوں نہ ہوں محتاج اس کے انبیا
ہے وہ بے شک رحمۃ للعالمینؐ   اس کی مسجد ہے یہ سب روئے زمیں

مولانا امداد مہاجر مکی رحمۃ اللہ (م - ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء) ہجرت کرکے حرم شریفین پہنچے تو عرض کیا :

کر کے نثار آپ پہ گھر بار یا رسولؐ
اب آ پڑا ہوں آپ کے دربار یا رسولؐ
عالم، نہ متقی ہوں، نہ زاہد نہ پارسا
ہوں امتی تمہارا گنہ گار یا رسولؐ
دونوں جہاں میں مجھکو وسیلہ ہے آپؐ کا
کیا غم ہے گرچہ ہوں میں بہت خوار یا رسولؐ

شاہ دلدار علی مذاق بدایونی (م ۔ ۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۴ء) بڑے عاشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تھے کہتے ہیں :

ہر رنگ میں ہے وہ چمن آرائے مدینہ — ہر گل میں ہے بوئے گل زیبائے مدینہ
دل عرش ہے تیرا شہ والائے مدینہ — تو آئے تو سینہ مرا ہو جائے مدینہ

بیان (یزدانی) میرٹھی (م ۔ ۱۳۱۷ھ / ۱۹۰۰ء) نے بڑی والہانہ نعتیں لکھی ہیں ۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :

فلک پہ کوئی حیراں کوئی آوارہ محمدؐ کا
خدا ایک ایک ثابت اور سیارہ محمدؐ کا
فلک کی حرکتوں سے کھل گیا ارباب معنی پر
کہ برسوں رہ چکا ہے عرش گہوارہ محمدؐ کا
اذاں ہے شور اس سلطانِ دیں کے کوسِ شاہی کا
سدا بجتا ہے پانچوں وقت نقارہ محمدؐ کا

امیر مینائی لکھنوی (م ۔ ۱۳۱۸ھ / ۱۹۰۰ء) کا ایک دیوان ہی نعت پر ہے ۔ چند اشعار یہ ہیں :

حقا قسیم کوثر و باغ جناں ہے تو — مقصودِ آفرینشِ کون و مکاں ہے تو
مسند نشینِ انجمنِ کن فکاں ہے تو — مہرِ قبول و خاتمِ پیغمبراں ہے تو

"بعد از خدا بزرگ توئی، قصہ مختصر"

ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے :

مدینہ جاؤں، پھر آؤں، مدینہ پھر جاؤں
تمام عمر اسی میں تمام ہو جائے

یہ شعر بھی خوب ہے :

خدا کریم، محمدؐ شفیع روز جزا
امیرؔ کیا ہے حقیقت مرے گناہوں کی

محسنؔ کاکوروی رم - ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) نے اپنی پوری عمر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں صرف کر دی۔ مثنوی صبح تجلّی میں کہتے ہیں :

محبوبِ خدا، نبیِ مرسل صبحِ دو مینِ روزِ اول
شاہنشہِ انبیا محمدؐ تاجِ سرِ اصفیا محمدؐ
واللیل اشارتے ز مویش والشمس عبارتے ز رویش
خورشید سپہر دین محمدؐ نورِ عین الیقین محمدؐ

مولانا حالیؔ رم - ۱۳۳۳ھ / ۱۹۱۴ء) نے مسدس میں کس قدر بلیغ نعت لکھی ہے :

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ

اسی طرح اور بھی بند ہیں۔

مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ رم - ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء) نے تو عشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) میں غلو ہی کی وجہ سے اپنے بہت سے مخالفین پیدا کر لیے تھے۔ ان کا دیوان حدائق بخشش

بہت مشہور ہے۔ ایک نعت ملمع مکشوف میں ہے، اور اپنے
ردو حصے)
طرز کی آپ نظیر ہے:

لم یاتِ نظیرُک فی نظرٍ مثل تو نہ شد پیدا جانا
جگ راج کو تاج تورے سر، سو ہے تجھکو شہِ دوسرا جانا
البحر علا والموج طغیٰ من بیکس و طوفاں ہوش ربا
منجدھار میں ہوں، بگڑی ہے ہوا موری نیا پار لگا جانا
یا شمس نظرتِ الی اللیلی چو بطیبہ رسی عرضے بکنی
توری جوت کی جھلجھل جگ میں رچی مری شب نے نہ دن ہونا جانا

خواجہ محمد اکبر، اکبر میرٹھی (م۔ ۱۳۴۸ھ/ ۱۹۳۰ء نے عجیب والہانہ انداز سے نعتیں لکھی ہیں اور اسی لیے انھیں مقبولیت عام حاصل ہے۔

ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہے نورِ مجسم قد زیبائے محمدؐ — آنکھوں میں بٹھالوں جو نظر آئے محمدؐ
سب نبیوں کے سر پہ تو رہا عرش کا پایا — اور عرش کی چوٹی پہ کفِ پائے محمدؐ
اکبر تو نہیں دفن ہے اس راہ گزر میں؟ — کس سمت سے آتی ہے صدا "ہائے محمدؐ"

مولانا محمد علی جوہر (م۔ ۱۳۴۹ھ/ ۱۹۳۰ء) نے جو کچھ کہا اور جو کچھ لکھا اس کی نظیر مشکل سے ملتی ہے۔ نعت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تنہائی کے سب دن ہیں، تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں
ہر لحظہ تشفی ہے، ہر آن تسلی ہے
ہر وقت ہے دل جوئی ہر دم ہیں مداراتیں
کوثر کے تقاضے ہیں، تسنیم کے وعدے ہیں
ہر روز یہی چرچے، ہر روز یہی باتیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اِک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں
بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بلا بھیجیں
بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

سید ریاض احمد ریاض خیرآبادی رم۔ (۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء)

لکھتے ہیں:

نام کے نقش سے روشن یہ نگینہ ہو جائے
کعبۂ دل، مرے اللہ، مدینہ ہو جائے
وہ چمک درد کی ہو دل میں کہ بجلی چمکے
دامنِ طور ذرا آج یہ سینہ ہو جائے
دل ہے ہاتھ میں تیرے، مرے پہلو کے عوض
چاہتا ہوں مری خاتم کا نگینہ ہو جائے

اصغر حسین، اصغر گونڈوی رم۔ (۱۳۵۵ھ / ۱۹۳۶ء) کے چند اشعار

ملاحظہ ہوں:

دلِ نثارِ مصطفےؐ جاں پائمالِ مصطفےؐ
یہ اویسِ مصطفےؐ ہے وہ بلالِ مصطفےؐ
دونوں عالم تھے مرے حرفِ دعا میں غرق و محو
میں خدا سے کر رہا تھا جب سوالِ مصطفےؐ
عظمتِ تنزیہ دیکھی، شوکتِ تشبیہ بھی
ایک حالِ مصطفےؐ ہے، ایک قالِ مصطفےؐ

علامہ اقبال رم۔ (۱۳۵۷ھ / ۱۹۳۸ء) نے فارسی میں زیادہ
اچھی نعتیں لکھی ہیں۔ اردو کے چند اشعار یہ ہیں:

سالارِ کارواں ہے میرِ حجازؐ اپنا
اس نام سے ہی باقی آرامِ جاں ہمارا!

وہ دانائے سُبُل، ختم الرُّسُل، مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں وہی طٰہٰا

مولانا احسن مارہروی (م - ۱۳۵۹ھ/ ۱۹۴۰ء) اہلِ دل بزرگوں میں سے تھے۔ ایک غزل میں فرماتے ہیں:

ہر اک ذرّہ چمک اٹھا ہے مہتاب ضیا بن کر
فضا کو جگمگایا آپؐ نے شمس الضحیٰ بن کر
مرے سرکارؐ آئے دردِ عصیاں کی دوا بن کر
سکونِ قلبِ مضطر، غم زدوں کا آسرا بن کر
خلیل اللہ ہے کوئی، کلیم اللہ ہے کوئی
مگر آقا مرے آئے ہیں محبوبِ خدا بن کر
مجھی پر منحصر کیا ہے؟ شہنشاہِ زمانہ بھی
انھی کے آستاں پر آ رہے ہیں بے نوا بن کر
سمجھ سے ماورا ہستی کو احسنؔ کوئی کیا سمجھے
کہ دنیا میں مرے سرکارؐ آئے جانے کیا بن کر

مولانا شفق عماد پوری (م - ۱۳۶۳ھ/ ۱۹۴۴ء) خوب لکھتے ہیں:

فیضِ دمِ مسیح کی دہر میں کیا ہوا چلی
نرگسِ خفتہ جاگ اٹھی کھلنے لگی کلی کلی
غنچے کا پٹکا کھل گیا گل کی قبا مسک گئی
دوڑیں چمن کی نکہتیں ایسی پڑی چلا چلی

غنچۂ گل نکل گیا گوشۂ اعتکاف سے
بلبل بے قرار کے دل کو ہے کیسی بے کلی
ابر کہے ہو الغفور، نرگسِ تر ہو البصیر
پھول پڑھیں ہو الجلیل، سرو کہے ہو العلی
آنکھیں بچھائیں راہ میں بلبلِ دل فروز نے
کہنے کو خیر مقدمِ سرورِ دیں، صبا چلی

بیدم وارثی (م۔ ۱۳۶۳/ ۱۹۴۴ء) نے بھی بہت نعتیں لکھی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

آئی نسیم کوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم
کھنچنے لگا دل سوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم
کعبہ ہمارا کوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم
مصحفِ ایماں روئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم
بھینی بھینی خوشبو مہکی بیدم دل کی دنیا لہکی
کھل گئے جب گیسوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم

مولانا حسرت موہانی (م۔ ۱۳۷۰ھ/ ۱۹۵۱ء) جیسے بے ریا بزرگ بہت کم ہوتے ہیں۔ کیسی بے قراری کا اظہار فرما رہے ہیں کہ:

پھر آنے لگیں شہرِ محبت کی ہوائیں
پھر پیشِ نظر ہو گئیں جنت کی فضائیں
ہاتھ آئے اگر خاک ترے نقشِ قدم کی
سر پر کبھی رکھیں، کبھی آنکھوں سے لگائیں
نظارہ فروشی کی عجب شان ہے پیدا
یہ شکل و شمائل، یہ عبائیں، یہ قبائیں

سید انور حسین آرزو لکھنوی (م۔ ۱۳۷۰ھ/۱۹۵۱ء)

بھی خوب لکھتے ہیں :

ازل سے نقشِ دل ہے نازِ جانانہ محمدؐ کا
کیا ہے لوح نے محفوظ افسانہ محمدؐ کا
دوئی اک داغِ تہمت، غیرتِ الزام بے معنی
وہ اپنا ہے جسے اپنا سے یارانہ محمدؐ کا
شعاع اس پار شیشے کے، نظر اُس پار شیشے کے
جھلک دیکھی کہ پہنچا اڑ کے پروانہ محمدؐ کا

مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ رم - ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۶ء) کے علم وفضل، ورع وتقویٰ، عشق اور وارفتگی سے کون واقف نہیں ؟ وہ فرماتے ہیں کہ :

پیارے محمد جگ ساجن — تم پر واروں تن من دھن
تم ری صورتیا من موہن — کبھو کرائیو تو درشن
جیا کنھڑے، دلوا ترسے — کڑکا کڑکے بدرا ترسے
صلی اللہ علیک نبیاً

تم ری دوُریا کیسے چھوڑوں — تم سے توڑوں، کس سے جوڑوں
تم ری گلی کی دھول بٹوروں — تم رے نگر میں دم بھی توڑوں
جی کا اب ارمان یہی ہے — آٹھوں پہر اب دھیان یہی ہے
صلی اللہ علیک نبیاً

مولانا ظفر علی خاں رم - ۱۳۷۶ھ/ ۱۹۵۶ء) کو کیا نہیں آتا تھا ؟ تحریر وتقریر کے ایسے دھنی تھے کہ بڑے بڑے لوگ ان کے سامنے شرما جاتے تھے۔ ان کی نعتوں میں سے خصوصی طور پر یہ غزلیں بہت مقبول ہیں :

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اِک روز چمکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں
گر ارض و سما کی محفل میں لولاکَ لما کا شور نہ ہو
یہ رنگ نہ ہو گلزاروں میں یہ نور نہ ہو سیاروں میں

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنّا تمھی تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمھی تو ہو
سب کچھ تمھارے واسطے پیدا کیا گیا
سب غایتوں کی غایتِ اولیٰ تمھی تو ہو

(علی سکندر) جگر مراد آبادی (م۔ ۱۳۷۹ھ/۱۹۶۰ء) نے حج کے موقع پر یہ نعت لکھی تھی:

اِک رند ہے اور مدحتِ سلطانِ مدینہ
ہاں کوئی نظر، رحمتِ سلطانِ مدینہ
تو صبحِ ازل، آئینۂ حسنِ ازل بھی
اے صلِّ علیٰ صورتِ سلطانِ مدینہ

(احمد حسین) امجد حیدر آبادی (م۔ ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۱ء) اپنی نعتیہ اور صوفیانہ رباعیوں کے لیے مشہور ہیں۔ ایک جگہ اس طرح لکھتے ہیں:

کیا شکل کھینچی واہ وا، قرباں ترے، دستِ قضا
پڑھتے ہیں جس کو دیکھ کر حور و ملک صلِّ علیٰ
کیا رنگ ہے، کیا روپ ہے، کیا حسن ہے نامِ خدا
مَنْ وجہُہٗ شمس الضحیٰ مَن خدُّہٗ بدر الدجیٰ
مَنْ ذاتہٗ نور الھدیٰ مَنْ کفُّہٗ بحر الھمم

"زادِ حرم" حمید صدیقی لکھنوی رم۔ ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۵ء) بڑے عاشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تھے۔ گلبانگِ حرم ان کی نعتوں کا مجموعہ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اے ساقیِ کونینؐ یہ کیا بوالعجبی ہے
سیراب ہوں میں پھر بھی وہی تشنہ لبی ہے
اب اور کسی بزم کو کیا دیکھیے جاکر
آنکھوں میں سمایا ہوا دربارِ نبیؐ ہے
کٹتے ہیں مدینے کے تصوّر میں شب و روز
چھایا ہوا اب تک اثرِ نیم شبی ہے

شکیل بدایونی رم۔ ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰ء) بھی خوب لکھتے ہیں:

موت ہی نہ آجائے کاش ایسے جینے سے
عاشقِ نبیؐ ہو کر دُور رہوں مدینے سے
فرقتِ محمدؐ میں خوں فشاں ہیں یوں آنکھیں
جیسے مے چھلکتی ہو سرخ آبگینے سے
زندگی کے طوفاں میں جب کہ ناخدا تم ہو
کیوں نہ ہوں خدا والے مطمئن سفینے سے

(سردار حسین خان) بہزاد لکھنوی رم۔ ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء) عشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) میں سرشار رہتے تھے۔ کئی حج کر چکے تھے۔ کہتے ہیں:

مدینے، دل و روحِ جاں لے کے جاؤں
محبت کا سارا جہاں لے کے جاؤں
"محمد محمد" ہو، ہونٹوں پہ میرے
میں ایماں کی گل کاریاں لے کے جاؤں

جو تڑپا رہا ہے مری زندگی کو
وہی دل کا دردِ نہاں لے کے جاؤں

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ (م - ۱۳۹۶ھ / ۱۹۷۶ء) کوئی شاعر نہیں تھے لیکن کس محبت سے لکھتے ہیں :

پھر پیشِ نظر گنبدِ خضرا ہے، حرم ہے
پھر نامِ خدا ہے روضۂ جنت میں قدم ہے
پھر شکرِ خدا سامنے محرابِ نبیؐ ہے
پھر سر ہے مرا اور ترا نقشِ قدم ہے
محرابِ نبیؐ ہے کہ کوئی طورِ تجلّی
دل شوق سے لبریز ہے اور آنکھ بھی نم ہے
پھر منتِ دربان کا اعزاز ملا ہے
اب ڈر ہے کسی کا نہ کسی چیز کا غم ہے
پھر بارگہِ سیّدِ کونینؐ میں پہنچا
یہ ان کا کرم، ان کا کرم، ان کا کرم ہے

آج کے سب سے مشہور نعت گو شاعر عبدالعزیز خالد ہیں جو بکثرت زبانوں کے عالم اور بکثرت کتابوں کے مصنّف ہیں۔ فارقلیط، منحمنّا اور لحن صریر ان کے خالص نعتیہ مجموعے ہیں۔

فارقلیط کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

میں فرشِ زمیں ہوں، تو سقفِ سما ہے
میں سانسوں کا مہماں، تو معرج ہوا ہے
قلم بند ہو کلک و خامہ سے کیسے؟
بیاں تیرے حسنِ گلو سوز کا ہے

سنی ام معبد سے تعریف تیری
بہت تجھ سے ملنے کو جی چاہتا ہے
دمِ گفتگو منہ سے کرنوں کی بارش
دہن مہرِ تاباں کو شرما رہا ہے
وسیمٌ قسیمٌ بعینیہ و عجٌ
اسے دیکھنا انشراح و شفا ہے

ان کے علاوہ احسان دانش، حفیظ جالندھری، ماہر القادری اقبال عظیم، غلام مصطفےٰ تبسم، نعیم صدیقی، رعنا اکبرآبادی، ذہین شاہ تاجی، صبا اکبرآبادی، جمیل الدین عالی، ڈاکٹر ابراہیم خلیل، حکیم اکرام حسین سیکری، برگ یوسفی، قاصد عزیز، بشیر نزواری وغیرہ نعت میں خصوصیت رکھتے ہیں اور خواتین میں خورشید آرا بیگم، وحیدہ نسیم، ادا جعفری، مظہر النساء مظہر، تبسم (فاطمہ فاروقی) تہنیت (بیگم ڈاکٹر زور) وغیرہ بھی نعت لکھتی رہتی ہیں [1]

---

[1] نعت کے ساتھ حمد کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اردو شعراء میں غالباً واحد شخصیت مفتی غلام سرور لاہوری (م ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء) کی ہے جنھوں نے حمد ہی حمد لکھی ہے ان کا دیوان حمد ایزدی کانپور سے ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء میں شائع ہوا جس میں حمد و تزکیۂ نفس ہی کے مضامین ہیں ایک جگہ فرماتے ہیں۔

عاجزی کر عاجزی اے خاکسار
کیونکہ ہے یہ عجز تیرا افتخار
گلشنِ دنیا کا بن کر عندلیب
سیر کر در ہر خزاں و ہر بہار
گاہ ذوق و شوق میں ہو نغمہ زن
گاہ گل کی یاد میں رو زار زار
ہائے کوئی خار بھی اس میں اگر
رکھ نہ کچھ بھی اپنے دل میں اس سے عار
غم نہ دنیا کا کھا ہرگز غم نہ کھا
دل کو رکھ اس میں بحال و برقرار
کیوں نہ بخشے گا تجھے رزاق رزق
کیوں نہ پالے گا تجھے پروردگار
برکنارہ اس سے رہو اے مردِ حق
ہے یہ دنیا بحرِ ناپیدا کنار
کر کے عاجز مار ڈالے مرگ نے
جب کہ زال و رستم و اسفندیار
باوجود ضعف و عجز و لاغری
پھر ہو اے سرور ترا کیا اعتبار

منقبت نگاری :

نعتیہ شاعری کے ذیل میں منقبت نگاری بھی آجاتی ہے۔ علی قطب شاہ (م - ۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء) اور اس کے ہم عصر ملا وجہی کے یہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی منقبت میں اشعار ہیں۔ ولی دکنی (م - ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء) کے یہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ وجیہ الدین علوی رحمۃ اللہ علیہ (م - ۹۹۸ھ/۱۵۸۹ء) کی منقبت ملتی ہے۔ پھر اکثر شعراء کے یہاں کچھ نہ کچھ موجود ہے[۱] البتہ مومن (م - ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء) کے یہاں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اور حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی مدح میں باقاعدہ قصیدے پائے جاتے ہیں۔ جنگ آزادی کے وابستگان میں بہادر شاہ ظفر (م - ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء) نے حضرت شاہ فخرالدین علیہ الرحمہ (م - ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۵ء) کو بچپن میں دیکھا تھا اور اسی وقت سے شاہ صاحب سے انھیں عقیدت تھی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :

اے ظفر میں کیا بتاؤں تجھ سے جو کچھ ہوں سو ہوں
لیکن اپنے فخر دینؒ کے کفش برداروں میں ہوں

غالب (م - ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۹ء) نے مرزا علاؤالدین احمد کے نام ایک خط میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جو منقبت کی ہے اس میں اپنے دینی جذبات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے اردو دیوان میں دو قصیدے بھی ملتے ہیں۔ جو اس طرح شروع ہوتے ہیں :

ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بیکار
سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

---

[۱] دیکھیں راقم الحروف کا مضمون "اردو شعراء کے دینی عقائد - تحقیقی جائزہ" - نگار (۱۹۶۲ء)

[۲] یہی زمانہ انیس (م - ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء) اور دبیر (م ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء) کا ہے جن کے مراثی بھی تقدیسی ادب / منقبت ہی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ (م - ۱۲۸۶ھ/ ۱۸۶۹ء) حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (م - ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۶ء) سے بیعت تھے - پھر شاہ ابو سعید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (م - ۱۲۵۰ھ/ ۱۸۳۴ء) کے صاحبزادے شاہ عبد الغنی مجددی رحمۃ اللہ علیہ (م - ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۹ء) سے بیعت ہوئے - یہ سب نقشبندی بزرگ تھے - اسی مناسبت سے شیفتہ نے اپنے دو بیٹوں کا نام محمد نقشبند خان اور محمد اسحاق خان رکھا تھا -

شیفتہ کے مطبوعہ دواوین میں ان بزرگوں کے متعلق کوئی منقبت نہیں ملتی لیکن اس غیر معمولی عقیدت کی وجہ سے قیاس یہی کہتا ہے کہ انھوں نے ضرور منقبت لکھی ہوگی جو بہت ممکن ہے کسی مخطوطے میں موجود بھی ہو[1]

منیر شکوہ آبادی (م - ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء) نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہلِ بیت رضی اللہ عنہ کی مدح میں قصیدے لکھے ہیں - حضرت علی رضی اللہ عنہ کی منقبت کا ایک قصیدہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

نورِ خورشید جو ہو صاعقۂ طورِ حمل
موسیِ روز کرے مصرِ دلِ شب میں عمل
مصرِ شب میں جو کرے بادشہِ روز عمل
دلِ فرعون میں پھونکے یدِ بیضا مشعل
پرتوِ مہر جو ہو شمعِ شبستانِ حمل
غازۂ صبح بنے قشقۂ ہندوے زحل

---

[1] شیفتہ کے یہ اشعار انھی بزرگوں کے فیضِ صحبت کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں -

پیرِ مغاں نے رات کو وہ کچھ دکھا دیا
ہرگز رہا نہ دھیان بھی حسنِ مجاز کا

اکثر ہوا ہے مجھکو سفر در وطن مگر
لایا نہ دوستوں کے لیے ارمغاں ہنوز

اہلِ طریق کی بھی روش سب سے ہے الگ
جتنا زیادہ شغل، زیادہ فراغ بال

امیر مینائی (م - ۱۳۱۸ھ / ۱۹۰۰ء) کا سلسلۂ نسب حضرت شاہ مینا
سے ملتا ہے۔ شاہ صابری علیہ الرحمۃ سے خود بھی بیعت تھے۔ ضمناً کہتے ہیں:

امیران پیشواؤں کا میں صدق دل سے ہوں پیرو
جو ہیں صدرِ شریعت پر بجائے احمدِ مرسل

امیر نے نعت میں تین طویل قصیدے لکھے ہیں اور ایک قصیدہ حضرت
علی رضی اللہ عنہ کی منقبت میں اس طرح ہے:

کیونکر نہ کروں سلکِ معانی کو میں تسخیر
خامہ ہے مرا دستِ ید اللہ کی شمشیر
آئے جو تعلی پہ مری ہمتِ عالی
دشوار نہیں قلعۂ افلاک کی تسخیر
جو معنیِ روشن ہے وہ ہے غیرتِ خورشید
سودا نہیں مجھکو جو کروں مہر کو تسخیر[۱]

انھوں نے ایک قصیدہ (مومن کی زمین میں) حضرت امام حسین رضی اللہ
عنہ کی مدح میں لکھا ہے جس کا مطلع یہ ہے:

نشاطِ دہر سے ہو کس طرح نہ دل مایوس
کہ چار دن کی یہ مہماں ہے مثلِ شمعِ عروس

داغ دہلوی (م - ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۴ء) منقبت سے تعلق بہت کم
رکھتے ہیں تاہم ایک جگہ کہتے ہیں:

فریاد تمھیں سے ہے مری تکلیف سہی کیسی
ہو داد طلب کی داد رسی سلطان الہند غریب نواز

محسن کاکوروی (م - ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) نعت کے شاعر تھے۔ پھر بھی

---

[۱] امیر کے قصائد پر مفصل مضمون کے لیے دیکھیں راقم الحروف کی کتاب "تحریر و تقریر"، حیدر آباد ۱۹۶۲ء۔

ضمناً کئی جگہ منقبت بھی لکھتے ہیں "نظم دل افروز" میں کہتے ہیں:

درم تقریر موسیٰ نیر سے اصحاب مکرم میں
کمالِ آلِ ابراہیمؑ نیری آلؑ اطہر میں
وقارِ ہیبتِ ہارون ہے عباسؓ و حمزہ میں
جلالِ تیغِ یوشع تیغِ سلمانؓ و ابوذرؓ میں
تری نسبت سے حسنِ یوسفی و صبرِ ایوبی
گل اندامانِ جنت، سبطِ اکبر سبطِ اصغر میں

مولانا شبلی رح۔ ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء) کی مذہبی اور اخلاقی نظمیں جو آل و اصحاب رضی اللہ عنہم سے متعلق ہیں منقبت ہی کہلائیں گی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

وارثِ عدلِ پیمبرؐ عمرؓ ابنِ الخطاب
ہیچ تھی جن کے لیے منزلتِ تاج و سریر
مجمعِ عام میں لوگوں سے انھوں نے یہ کہا
"مہر باندھو نہ زیادہ کہ ہے یہ بھی تبذیر"
ایک بڑھیا نے وہیں ٹوک کے فوراً یہ کہا
"تجھ کو کیا حق ہے جو تو کرتا ہے ایسی تقریر"

مولانا حالی رح۔ ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۴ء) نے باقاعدہ کوئی منقبت نہیں لکھی۔ البتہ کہیں کہیں ایسے اشعار کہے ہیں:

خلیفہ تھے امت کے ایسے نگہباں
ہو گلے کا جیسے نگہبان چوپاں
سمجھتے تھے ذمی و مسلم کو یکساں
نہ تھا عبد و حر میں تفاوت نمایاں
کنیز اور بانو تھیں آپس میں ایسی
زمانے میں ماں جائی بہنیں ہوں جیسی
(مسدس)

تن پہ تھا فاروقِ اعظم کے پھٹا کرتا مگر
قوم کی خاطر بھری نیت نہ لیکر کیسہ تھم
(فلسفۂ ترقی)

اب بڑائی کا ہے استحقاق پر سارا مدار
ہوگا جو کرار اس کو مرحمت ہوگا نشاں (تحفۃ الاخوان)

البتہ حالی نے شاہ عبدالغنی مجددی رحمۃ اللہ علیہ (م۔ ۱۸۷۹ء) کی مدح میں ایک عربی قصیدہ لکھا تھا جس کا مطلع یہ ہے:

هَوَى الْحُورِ بَلْوَى كُلِّ حِبْرٍ وَنَادِبٍ   وَفِتْنَةُ قِسِّيسٍ وَزَلَّةُ رَاهِبِ

اسماعیل میرٹھی (م۔ ۱۳۳۶ھ/ ۱۹۱۷ء) نے اپنے پیر غوث علی شاہ پانی پتی رح[۱] (م۔ ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء) کی مدح میں کہا ہے:

لب پہ آیا نامِ شہ غوثِ علی
بے تکلف کِھل گئی دل کی کلی

اے تجلّیِ اخیرِ ذوالجلال
تھا کمالِ بندگی تیرا کمال

ہاں محمدؐ وار، تو نامِ خدا
کر گیا ہے بندگی کا حق ادا

ترکِ دنیا، ترکِ عقبیٰ، ترکِ جاں
قول و فعل و حال سے تیرے عیاں

اے تری آواز آوازِ خدا
اور خاموشی تری رازِ خدا

تو نہ تھا کچھ عینِ عین اللہ تھا
ظاہرا بندہ، نہانی شاہ تھا

---

[۱] وحید الدین سلیم نے بھی غوث علی شاہ کی مدح میں ایک فارسی قصیدہ لکھا تھا جس کا مطلع یہ ہے۔

صبحدم مہرۂ زر چرخ چو افشاند زچنگ
خاطر ما شدہ بلبل بہ ریاضِ فرہنگ

مولانا احمد رضا خاں بریلوی رم - ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) [1] نے بزرگانِ دین کی کئی منقبتیں لکھی ہیں۔ حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ رم - ۵۶۱ھ/۱۱۶۵ء) کی خدمت میں عرض کرتے ہیں:

ترا ذرّہ مہِ کامل ہے یا غوث
ترا قطرہ یم سائل ہے یا غوث

کوئی سالک ہے یا واصل ہے یا غوث
وہ کچھ بھی ہو ترا سائل ہے یا غوث

قدِ بے سایہ ظلِ کبریا ہے
تو اس بے سایہ ظل کا ظل ہے یا غوث

تری جاگیر میں ہے شرق تا غرب
قلمرو میں حرم تا حل ہے یا غوث

دلِ عشق و رخِ حسن آئینہ ہے
اور ان دونوں میں تیرا ظل ہے یا غوث

ریاض خیر آبادی رم - ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۴ء) لکھتے ہیں:

پردے سے حشر کے دن قاتلِ عثماں نکلا
آج بھی خون سے نم صفحۂ قرآں نکلا

اولیت کا شرف حضرتِ صدیق رضؓ کو ہے
عارف ایسا نہ کوئی صاحبِ ایقاں نکلا

حبذا صولتِ فاروق رضؓ سیاست آئیں
کہ جہاں دورِ خلافت کا ثنا خواں نکلا

---

[1] اسی زمانے میں احمد حسین خاں امروہوی نے حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ رم - ۱۰۳۴ھ) کی منقبت میں کئی قصیدے لکھے تھے۔ ایک قصیدے کے اشعار یہ ہیں۔

پلا دے ساقیا ساغر مجدّد الف ثانی کا
کہ ہوں مشتاق میں یکسر مجدّد الف ثانی کا

عوام ان کے اشارے سے بنے خاصانِ حق یکدم
یہ ہے مخصوص اک جوہر مجدّد الف ثانی کا

جناب غوثِ اعظم نے خبر دی ان کے آنے کی
نہ ہوگا کوئی بھی ہمسر مجدّد الف ثانی کا

بعد فاروقؓ کے ترتیبِ خلافت کے لیے
آپ سا کوئی نہ اے جامعِ قرآں نکلا
ہوتی تکمیلِ خلافت جو نبوّت کی طرح
یا علیؓ مرتبہ یہ آپ کے شایاں نکلا
نہیں ممکن جو لکھے کوئی یداللہ کے وصف
دست و بازوے نبیؐ، قوتِ ایماں نکلا[1]

ایک جگہ وہ اپنے پیر حاجی وارث علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ (م۔ ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) کے متعلق اشارہ کرتے ہیں:

آئینۂ وارث ہے ریاضؔ آپ کا سینہ
دل سینے میں ہے، دل میں تمنائے علیؓ ہے[2]

علامہ اقبال (م۔ ۱۹۳۸ء) نے باقاعدہ کوئی منقبت اردو میں نہیں لکھی لیکن ان کے دو مصرعے بہت سی منقبتوں پہ بھاری ہیں:

ع صدیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس

ع ثانیِ اسلام و غار و بدر و قبر

حسرت موہانی (م۔ ۱۹۵۱ء) نے حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ (م۔ ۵۶۱ھ/۱۱۶۶ء) سے یوں خطاب کیا ہے:

دستگیری کا طلب گار ہوں شیئاً للہ
میرِ بغداد، میں ناچار ہوں شیئاً للہ
مجھ سے اب دین کی پستی نہیں دیکھی جاتی
غلبۂ کفر سے بیزار ہوں شیئاً للہ

---

[1] ریاضِ رضوان (حیدرآباد دکن ۱۹۳۸ء) صفحہ ۵۹۵۔
[2] ایضاً صفحہ ۴۷۹۔

پائے رفتن، ہے، نہ ہے ہند میں جائے ماندن
سخت مشکل میں گرفتار ہوں شیئاً للّٰہ

سیماب اکبرآبادی (م۔ ۱۹۵۱ء) حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی مدح میں لکھتے ہیں:

حسینؓ ابن علیؓ وہ مجاہدِ ملّت
کہ جن کے نام سے لرزش میں تھا خرابۂ شام
شہیدِ جور و قتیلِ جفا و کشتۂ قوم
شجاع و صابر و مردِ وفا، امامِ انام
ہوں ان پہ اور تمام اہلِ بیت پر ان کے
ہر ایک لمحے میں لاکھوں درود اور سلام
غلط کہ خدمتِ اسلام فرضِ عین نہیں
یزید اب بھی ہیں لاکھوں مگر حسین نہیں [1]

شاید غلط نہ ہوگا اگر ہم ظفر علی خاں (م۔ ۱۹۵۶ء) کے یہ اشعار جو سلطان ٹیپو شہید (م۔ ۱۷۹۹ء) کی مدح میں ہیں منقبت [2] میں شمار کرلیں:

قوت بازوے اسلام تھی اس کی صولت
اس کی دولت کے دعاگوؤں میں شامل تھے ہنود
کہیں سوتے میں نہ کروٹ یہ مجاہد بدلے
اب بھی اس خوف سے ہیں لرزہ براندام حسود

---

[1] سیماب اکبرآبادی، کارِ امروز (آگرہ ۱۹۴۷ء) صفحہ ۹۰،

[2] سیماب نے سازو آہنگ میں (آگرہ ۱۹۴۱ء) چھپیں اشعار کی ایک نظم "سلطانِ شہید" کے عنوان سے لکھی تھی جس کا مطلع یہ ہے۔

پوچھ اے میسور اپنے ماضیِ ضوناک سے
برہنہ شمشیر اک چمکی تھی تیری خاک سے

اس کے اٹھتے ہی مسلمان کا گھر بیٹھ گیا
تھا قیامت کا قیام اور قیامت کا قعود
آخری قول یہ اس کا نہ ہمیں بھولے گا
جس سے قائم ہوئیں آئینِ حمیت کی حدود
"شیر اچھا ہے جسے مہلتِ یک روزہ ملی
یا وہ گیدڑ جسے بخشا گیا صد سالہ خلود"

"زائرِ حرم" حمید صدیقی لکھنوی (م۔ ۱۹۶۵ء) نے حضرت مجدّد الف ثانی سرہندی قدس سرہ کے متعلق سترہ اشعار میں منقبت لکھی ہے:

سرور افزا فضا سرہند کی معلوم ہوتی ہے
یہاں کی زندگی میں زندگی معلوم ہوتی ہے
کشش ایسی کہیں بھی دیکھنے سننے میں کب آئی
کبھی محسوس ہوتی ہے کبھی معلوم ہوتی ہے
فضا معمور رہے یوں حسن کے جلووں کی کثرت سے
کہ ہر ذرّے کو جیسے آگہی معلوم ہوتی ہے

پروفیسر ضیا احمد بدایونی (م۔ ۱۹۷۳ء) نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی یوں منقبت لکھی ہے:

جمع ہیں سبطِ مصطفیؐ تجھ میں صفاتِ سروری
شان و شکوہ جعفری، جاہ و جلال حیدری
راہِ خدا میں گھر دیا، سجدۂ حق میں سر دیا
نام وفا کا کر دیا تو نے زہے دلاوری
باغِ رسولؐ کے ثمر، کانِ بتول کے گہر
تیرے وجود پاک پر ختم ہے پاک گوہری

یہ عجب بات ہے بغیر نبی کب یہ بات ہے

خلق میں تیری ذات ہے معجزۂ پیمبری

ہیں کہ تیری ولا نہیں، الفت مصطفیٰؐ نہیں

دین سے واسطہ نہیں، دعویٔ دیں سبک سری

مولانا افسر صدیقی امروہوی (م - ۱۹۸۴ء) نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شان میں اس طرح لکھا ہے:

کیا عجب ہے کہ بدل جائے ہوائے عالم
بارشِ رحمتِ باری ہو فلک سے پیہم
ایک اک گل سے نمایاں ہوں بہاریں سوسو
ایک اک غنچے سے پیدا ہوں ہزاروں عالم

دیکھنے والے کہیں دیکھ کے اللہ اللہ
یہ خیابانِ چمن ہے کہ گلستانِ ارم
بلبل و گل کو بہم دیکھ کے سرو و قمری
ربط باہم کے لیے کرنے لگیں قول و قسم

توڑ کر پھینک دے خود جال کو اپنے صیّاد
باغبان طائرِ بے پر پہ کرے لطف و کرم
کیوں کہ دنیا پہ ہوا تختِ خلافت کو نصیب
ذاتِ فاروقِ معظمؓ سے مقامِ اعظم[۱]

اسی طرح کی منقبتیں دوسرے شعراء کے یہاں بھی پائی جاتی ہیں۔

صوفیانہ شاعری:

سورۃ آل عمران کی آیت ہے:

---

[۱] شہاب تخیل، کراچی ۱۹۳۹ء صفحہ ۸۷،

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

بیشک اللہ پاک نے احسان کیا ایمان والوں پر کہ بھیجا ان میں رسول انھی میں کا، جو پڑھتے ہیں ان پر آیتیں اس کی اور تزکیہ کرتے ہیں ان کا اور سکھاتے ہیں ان کو کتاب اور حکمت اور وہ لوگ تو پہلے صریح گمراہی میں تھے۔

اس آیت سے واضح ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک منصب تزکیہ نفس فرمانے کا بھی تھا، اسی لیے آپ کے نائبین یعنی علماء اور صلحائے اس کام کو اختیار کیا اور بعد میں صوفیہ کے باقاعدہ مختلف سلاسل قائم ہو گئے۔

برصغیر پاک و ہند میں تبلیغ اور اسلام کی ترویج میں صوفیہ ہی پیش پیش رہے تھے اور اردو کا ابتدائی سرمایہ انھی بزرگوں کی سعی کا مرہون منت ہے۔ ولی دکنی (م۔ ۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۷ء) حضرت علی رضا (م۔ ۱۱۴۳ھ/ ۱۷۳۰ء) سے بیعت تھے۔ جو حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ (م۔ ۱۰۳۴ھ/ ۱۶۲۴ء) کے پڑپوتے تھے۔ پھر حضرت مظہر جان جاناں شہید رحمۃ اللہ علیہ (م۔ ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۰ء) اور خواجہ میر دردؔ[۱] (م۔ ۱۱۹۹ھ/ ۱۷۸۴ء) بھی اسی سلسلۃ الذہب سے متعلق ہیں۔ بہادر شاہ ظفر (م۔ ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۲ء) نے حضرت شاہ فخر الدین علیہ الرحمۃ (م۔ ۱۱۹۹ھ/ ۱۷۸۴ء) کو بچپن میں دیکھا تھا اور اسی وقت سے ان کو شاہ صاحب سے بڑی عقیدت تھی۔ ظفر کی بے بسی اور بے کسی نے انھیں تصوف اور

---

[۱] مولانا عبدالسلام ندوی نے شعر الہند حصہ دوم میں "صوفیانہ شاعری" ایک باب باندھا ہے جس میں مختلف متقدمین کے کلام سے صوفیانہ مضامین کے اشعار نقل کیے ہیں۔

شعر و شاعری کی طرف مائل کیا کیونکہ وہ سلطان ٹیپو شہید رحمۃ اللہ علیہ رم۔
۱۲۱۴ھ/۱۷۹۹ء) کا انجام دیکھ چکے تھے:

اعتبارِ صبر و طاقت خاک میں رکھوں ظفر
فوج ہندوستان نے کب ساتھ ٹیپو کا دیا

ظفر کے چند متصوفانہ اشعار ملاحظہ ہوں:

جس کو کہ ڈھونڈتا ہوا میں ہر کہیں گیا
دل ہی میں تھا مرے وہ مجھے مل یہیں گیا
تنگ تھا وسعت سے جس کی عرصۂ ارض و سما
جی میں کیونکر لے دلِ آدم سمٹ کر آ گیا

وجودی نظریہ بھی پیش کرتے ہیں:

عالمِ صورت میں تو میں صورتِ آدم میں ہوں
عالمِ معنی میں لیکن اور ہی عالم میں ہوں

غالب کی طرح وہ بھی سازِ "انا البحر" چھیڑتے ہیں کہ:

مل گیا دریا میں جب قطرہ تو دریا ہو گیا
جزو جو کُل میں ہوا گم، جزو سے وہ کُل بنا

امیر مینائی رم۔ ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء) حضرت شاہ مینا رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاف میں سے تھے، اسی لیے زہد و تقویٰ کا مجسمہ تھے اور تصوّف سے خاص لگاؤ رکھتے تھے۔ ان کے چند اشعار یہ ہیں:

کونین میں ہے جلوۂ حسن و جمالِ دوست
ہے ایک روشنی کہ اِدھر بھی اُدھر بھی ہے
غافل نزول ہی تو کمالِ عروج ہے
خاکِ فنا ہی منزلِ آبِ بقا ہوئی

گل خود تھے بے ثبات گلستانِ دہر میں
تھے پیر فریب مفت ... [illegible]

محسن کاکوروی (م۔ ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۵ء) شروع ہی سے [illegible]
گھرانے کے تربیت یافتہ ہیں اور رفقائی الرسول کی نعت [illegible]
ہوتے۔ ان کے کلام میں اکثر اسی عشق کی سرشاری نظر آتی ہے [illegible]
کی تشبیہات اور استعارات بھی تصوف کی مصطلحات سے [illegible]
مثنوی صبحِ تجلی میں کہتے ہیں:

سالک ہے چمن میں نہرِ موزوں | مجذوب ہے شاخِ بید مجنوں
ہے صوفیِ صاف دل صنوبر | تحریکِ نسیم حالت آور
ہر تخم بہ خلوت آرمیدہ | ہر ایک ثمر غذا رسیدہ
ابدال ہیں برگ و نخل اوتاد | ہے نعم العبد سرو آزاد

اسماعیل میرٹھی (م۔ ۱۳۳۶ھ / ۱۹۱۷ء) حضرت غوث علی شاہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ (م۔ ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء) کے مرید تھے اور امیرانہ زندگی کے باوجود فقیرانہ مزاج رکھتے تھے ان کی نظم "شمعِ بینی" ان کے زاہدانہ مشرب سے تعلق رکھتی ہے اور غزلیات میں بھی یہ رنگ جگہ جگہ نظر آتا ہے مثلاً

حجابِ شاہدِ مطلق نہ اٹھا ہے نہ اٹھے گا
جسے ہم لامکاں سمجھے تھے وہ بھی اک مکاں نکلا
کھولا ہے مجھ پہ سرِ حقیقت، مجاز نے
یہ پختگی، صلہ ہے خیالاتِ خام کا
بزمِ ایجاد میں بے پردہ کوئی ساز نہیں
ہے یہ تیری ہی صدا غیر کی آواز نہیں

مولانا احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ (م۔ ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء)

اپنے علم و فضل، زہد و تقویٰ، اور عشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وجہ سے ایک انفرادی شان کے مالک تھے اور سلسلۂ قادریہ میں شاہ آلِ رسول مارہروی رحمۃ اللہ علیہ (م۔ ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۷۹ء) سے بیعت تھے۔ ان کی ایک غزل میں "محاسبۂ نفس" کے مضامین بڑی خوبی سے نظم ہوئے ہیں:

سونا جنگل، رات اندھیری، چھائی بدلی کالی ہے
سونے والو جاگتے رہیو، چوروں کی رکھوالی ہے

آنکھ سے کاجل صاف اڑا لیں یاں یہ چور بلا کے ہیں
تیری گٹھری تاکی ہے اور تو نے نیند نکالی ہے

سونا پاس ہے، سونا بن ہے، سونا زہر ہے اٹھ پیارے
تو کہتا ہے نیند ہے میٹھی، تیری مت ہی نرالی ہے

بادل گرجے، بجلی تڑپے، دھک سے کلیجا ہو جائے
بن میں گھٹا کی بھیانک صورت کیسی کالی کالی ہے

پانو اٹھا اور ٹھوکر کھائی، کچھ سنبھلا پھر اوندھے منھ
مینہ نے پھسلن کر دی ہے اور دھر تک کھائی نالی ہے

سید محمد بے نظیر شاہ وارثی (م۔ ۱۳۵۱ھ/ ۱۹۳۲ء) حضرت حاجی وارث علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے اس لیے ان کی طرح خود بھی جذب و مستی سے سرشار تھے۔ ان کا پورا کلام وحدۃ الوجود کا ترجمان ہے۔ مثلاً:

ازل جس بے نشاں کا نام ہے اس کا نشاں میں ہوں
نہاں خانے سے جو نکلا ہے وہ جلوہ عیاں میں ہوں

اگر بندہ کہوں خود کو تو خود کو غیرِ حق جانوں
خدا بھی کہہ نہیں سکتا کہ حاجب درمیاں میں ہوں

ہوا ہوں، ابر ہوں، بادہ ہوں، میں ساقی ہوں، میکش ہوں
سبو ہوں، جام ہوں، میخانہ ہوں، پیرِ مغاں میں ہوں

اصغر گونڈوی (م۔ ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء) حضرت شاہ عبدالغنی منگلوری کے مرید تھے۔ نشاطِ روح اور سرودِ زندگی میں ان کے اکثر اشعار متصوفانہ ہیں مثلاً:

جنونِ عشق ہیں ہستیِ عالم پر نظر کیسی
رخِ لیلیٰ کو کیا دیکھیں گے محمل دیکھنے والے

کار فرما ہے فقط حسن کا نیرنگ کمال
چاہے وہ شمع بنے، چاہے وہ پروانہ بنے

عشق کی فطرت ازل سے حسن کی منزل میں ہے
قیس بھی محمل میں ہے لیلیٰ اگر محمل میں ہے

علامہ اقبال (م۔ ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء) ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میرا تو عقیدہ ہے کہ غلو فی الزہد اور مسئلہ وجود مسلمانوں میں زیادہ تر بدھ مذہب کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ خواجہ نقشبند اور مجدد سرہندی کی میرے دل میں بہت عزت ہے۔ مگر افسوس کہ آج یہ سلسلہ بھی عجمیت کے رنگ میں رنگ گیا ہے۔ یہی حال سلسلۂ قادریہ کا ہے جس میں میں خود بیعت رکھتا ہوں۔"

اسی لیے وہ ایسے تصوف اور ایسے صوفی کو پسند کرتے ہیں جو عمل کے لیے تڑپا دے اور گوشہ نشینی یا بے عملی سے نفرت پیدا کرا دے۔ وہ کہتے ہیں:

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

فانی بدایونی (م۔ ۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء) کے کلام میں وحدۃ الوجود

جبر و اختیار، فنا و بقا کے مضامین زیادہ ہیں۔ مثلاً:

نور و منصور و طور ارے توبہ — ایک ہی تیری بات کا انداز

وہ یہیں ہیں جو وہ کہیں بھی نہیں — آئیے دل میں جستجو تو کریں

مجھے بلا کے یہاں آپ چھپ گیا کوئی — وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا

خواجہ عزیز الحسن مجذوب (م ۔ ۱۳۶۳ھ/۱۹۴۴ء) جناب مولانا اشرف علی تھانوی (م ۔ ۱۳۶۲ھ/۱۸۴۳ء) کے خاص مریدوں میں سے تھے اور مرشد کو ان کا یہ شعر بہت پسند تھا:

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی — اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی

چند اشعار یہ ہیں:

یہ کون آیا کہ دھیمی پڑ گئی لو شمع محفل کی
پتنگوں کے عوض اڑنے لگیں چنگاریاں دل کی

جب مہر نمایاں ہوا سب چھپ گئے تارے
تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا

پردے تعینات کے جس دن سے اٹھ گئے
عالم تمام جلوہ گہِ یار ہو گیا

مولانا حسرت موہانی (م ۔ ۱۳۷۰ھ/۱۹۵۱ء) حضرت مولانا عبدالوہاب (مولانا جمال میاں فرنگی محلی کے دادا) سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت تھے۔ ان کے یہاں بھی وحدۃ الوجود کے مضامین ملتے ہیں۔ مثلاً:

اہلِ نظر کو بھی نظر آیا نہ روئے یار
یاں تک حجابِ نور نے مستور کر دیا

ہر طرف بے خودی و بے خبری کی ہے نمود
قابلِ دید ہے دنیا ترے حیرانوں کی

حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

آج کے صوفیہ میں جناب ذہین شاہ تاجی کا مجموعۂ کلام آیاتِ جمال اور پروفیسر عبدالغنی نیازی کا مجموعہ نغماتِ عشق بھی اسی مسئلۂ وحدۃ الوجود کے مضامین کا خزینہ ہے:

بہرحال مذکورۂ بالا صوفیہ کے علاوہ بھی بہت سے حضرات کا متصوفانہ کلام موجود ہے جس پر مفصل طور پر لکھنے کی ضرورت رہے:

اخلاقی شاعری:-

اللہ پاک کا ارشاد ہے۔ وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْم ٥ اور آپ کو پیدا کیا گیا ہے عظیم اخلاق پر۔

اور خود رسول انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعلق فرمایا ہے:

انما بعثت لاتمم مکارم اخلاق ٥ میں تو اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کروں۔

یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں دین کے تمام فضائل کی تکمیل ہوئی۔ اسی لیے مسلمانوں کے ہر دور میں اخلاقیات پر علمی اور عملی طور پر ہمیشہ زور دیا گیا اور اردو جیسی مؤخر زبان میں بھی بلا مبالغہ سیکڑوں کتابیں اسی موضوع پر لکھی گئیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد کا زمانہ ہندوستانیوں اور خصوصاً مسلمانوں کے لیے سیاسی، معاشی اور معاشرتی بدحالی، نیز تہذیبی اقدار کی

شکست وریخت کا دور رہا ہے۔ غیر ملکی چمک دمک نے بہت سی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ لوگوں کے پیراہن بدلے، زبان بدلی اور دماغ بھی بدل گئے۔ لیکن وہ دل نہیں بدل سکے جن پر رب العالمین اور رحمۃ للعلمین (صلی اللہ علیہ وسلم) کا قبضہ تھا۔ چنانچہ ایسے اہل دل لوگوں نے دین کی روشنی میں نثر اور نظم دونوں کو پھیلانے کی کوشش کی اور اخلاقِ حسنہ کی تبلیغ کے لیے زبان اور دل دونوں کو آلۂ کار بنایا۔

سرسیّد نے ۱۸۷۰ء میں رسالہ تہذیب اخلاق جاری کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

”(تہذیب) سے مراد ہے انسان کے تمام افعال ارادی، اخلاق اور معاملات اور معاشرت اور تمدن اور طریقۂ تمدن اور صرف اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون اور ہنر کو اعلیٰ درجے کی عمدگی پر پہنچانا اور ان کو نہایت خوش اسلوبی سے برتنا۔ جس سے اصلی خوشی اور جسمانی خوبی پیدا ہوتی ہے اور تمکین و وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آجاتی ہے“۔ لیکن خاص اخلاقِ نبوی ﷺ کی تبلیغ کے لیے بکثرت نثری کتابیں وجود میں آئیں۔[1]

۱؎ دیکھیں قاموس الکتب (جلد اول)۔ کراچی ۱۹۶۱ء۔ اس میں سیرت طیبہ سے متعلق ۴۷۵ کتابوں کا ذکر ہے اور اخلاقِ مبارکہ سے متعلق چند کتابوں کے نام یہ ہیں۔ اخلاق نبی کریم ﷺ از واصف کسب النبی ﷺ از ظہور الحق عظیم آبادی، مطبوعہ ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۹ء۔ کتاب السعادت از اکرام الدین خاں، مطبوعہ ۱۲۹۱ھ مہدی مطبوعہ ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء۔ ترجمۃ الہدایت (امام ۱۸۷۴ء۔ اخلاقِ محمدی ﷺ از محمد علی یزدی، مطبوعہ ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء۔ آداب و اخلاق نبی کریم ﷺ (امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ) از عبدالواحد، مطبوعہ ۱۸۸۰ء۔ آداب و اخلاق (امام غزالیؒ)، مطبوعہ ۱۹۱۰ء۔ غزالی رحمۃ اللہ علیہ) مطبوعہ ۱۸۹۳ء۔ حمایت اخلاق از محمد عبدالوہاب عندلیبؔ، مطبوعہ ۱۹۲۵ء۔ احسانِ عام از چراغ علی، مطبوعہ ۱۹۲۵ء۔ خلق عظیم از ولی اللہ میر، مطبوعہ ۱۹۲۷ء۔ آداب الرسول ﷺ (بقیہ حاشیہ ص ۲۱۳)

مولانا حالی (م۔ ۱۳۳۳ھ / ۱۹۱۴ء) نے ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب کے مشاعروں میں نظمیں لکھیں[1] برکھا رُت، نشاطِ امید، حبِ وطن اور مناظرہ رحم و انصاف اسی انجمن کی یادگار ہیں۔ مؤخر الذکر نظم میں رحم اور عدل کی تقریریں کے بعد عقل ان سے کہتی ہے۔

فرق اصلا نہیں تم دونوں میں، لڑتے کیوں ہو
جب کہ تم ایک ہو، آپس میں جھگڑتے کیوں ہو
وہی اک شے ہے کہ ہے عدل کہیں نام اس کا
کہیں مظلوم کی فریاد رسی کام اس کا
رحم کہلائے جو مظلوم کی فریاد سُنے
عدل ٹھہرے جو سزا ظالم بے رحم کو دے

(بقیہ حاشیہ ص ۲۱۲)

از محمد صالح مطبوعہ ۱۳۴۸ھ / ۱۹۲۹ء۔ اسلامی روایات از محمد حنیف پھلواروی مطبوعہ ۱۹۳۱ء۔ البیّنات از مولوی محمد سلیم، مطبوعہ ۱۹۳۴ء۔ اسلامی اخلاق از نواب حبیب الرحمن شروانی مطبوعہ ۱۹۳۸ء، اخلاق و فلسفۂ اخلاق از حفظ الرحمن سیوہاروی، مطبوعہ ۱۹۴۲ء۔ اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر از مولانا مودودی، مطبوعہ ۱۹۴۵ء۔ آداب النبی از مفتی محمد شفیع، مطبوعہ ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۷ء۔ اسلام کا نظریۂ اخلاق از مظہر الدین صدیقی، مطبوعہ ۱۹۵۱ء۔ اسلامی اخلاق از انتظام اللہ شہابی، مطبوعہ ۱۹۵۶ء۔ اخلاق محمدیؐ از سید مجتبیٰ، مطبوعہ ۱۹۵۷ء۔

ان کے علاوہ سیر اور اوصاف صحابہؓ کے زیر عنوان کتابیں بھی قاموس الکتب مذکورہ میں درج ہیں۔

[1] فنِ شعر میں حالی اپنے معاصرین میں سب پر فوقیت رکھتے ہیں اس لیے ان کا ذکر پہلے کیا گیا ہے۔ حالی سے پہلے کے شعراء کے اخلاقی اشعار مولانا عبد السلام ندوی نے شعر الہند حصہ دوم میں صوفیانہ اور اخلاقی شاعری کے ذیل میں دیئے ہیں۔

وہی شفقت ہے کہ استاد کی ہے مار کبھی
اور ماں باپ کی ہو جاتی ہے چمکار کبھی

وہی شفقت ہے کہ ہے گھور کہیں، پیار کہیں
وہی جلوہ ہے کہ ہے نور کہیں نار کہیں

حالی کی دوسری نظمیں بھی عموماً اخلاقی ہیں لیکن مسدس (۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء) ان کا شاہکار ہے جس میں مسلمان قوم کے مد و جزر کی داستان، اس کو اس کی اصلاح اخلاق ہی کے لیے سنائی گئی ہے۔ اس مسدس کا ابتدائی بند ہی اس اصلاح کی نشان دہی کرتا ہے۔

کسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا — مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا
کہا، دکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا — کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا
مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں
کہے جو طبیب اس کو ہذیان سمجھیں

حالی کے رفیق محمد حسین آزاد (م۔ ۱۹۱۰ء) نے بھی بعض اخلاقی نظمیں لکھی ہیں۔ ان کے مجموعۂ نظم آزاد میں ایک تقریر ۱۵ر اگست ۱۸۶۷ء کی ہے جس میں نظم کے متعلق اصلاحی پروگرام ہے۔ اس مجموعے میں صبح امید، حب وطن، داد انصاف، ابر کرم، مصدر تہذیب، شرافت حقیقی وغیرہ مثنویاں ہیں۔ نوطرز مرصع اور اولوالعزمی (نظموں) میں بلند ہمتی کا درس ہے۔ مؤخر الذکر کا ایک بند ہے:

ہے سامنے کھلا ہوا میداں چلے چلو
باغ مراد ہے ثمر افشاں چلے چلو
دریا ہو بیچ میں کہ بیاباں چلے چلو
ہمت یہ کہہ رہی ہے کھڑی ہاں چلے چلو
چلنا ہی مصلحت ہے مری جاں چلے چلو

ڈپٹی نذیر احمد رم۔ (۱۹۱۲ء) گو کہ کوئی شاعر نہیں تھے لیکن انھوں نے کبھی کبھی اصلاحی کلام بھی لکھا ہے۔ ۱۸۹۲ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (اجلاس ہفتم) میں ۴۸ اشعار کی ایک نظم پڑھی تھی جس کے چند اشعار یہ ہیں :

مسلمانو! اگر تم میں ہے کچھ فکرِ رسا باقی
تو بول اٹھو کہ ہے اسلام کے مٹنے میں کیا باقی
شجاعت تھی تو وہ ہم سے گئی گزری ہوئی بالکل
نہ اب وہ ملک گیری ہے نہ وہ حرب و غزا باقی
نہ ہمت ہے، نہ جرأت ہے، نہ چستی ہے نہ چالاکی
نہ خوزحمت اٹھانے کی نہ زورِ دست و پا باقی
خدا جانے وہ کیسی سلطنت تھی؟ کیا تھا؟ کیونکر تھی
کہ تاریخی کتابوں میں ہے جس کا تذکرہ باقی
یہ ٹوٹی پھوٹی گنتی کی ریاست ہائے اسلامی
جنھیں روئے زمیں پر دیکھتے ہو جابجا باقی
مگر اس سطوت کبریٰ کی چندے یادگاریں ہیں
مسافر جا چکا لیکن ہے اس کا نقشِ پا باقی

مولانا شبلی رم۔ (۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء) نے باقاعدہ اخلاقی نظمیں لکھیں۔ تعمیر مسجد نبوی۔ ایک خاتون اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حلم و عفو، ایثار، مساوات، اسلام، خلافت فاروقی کا ایک واقعہ، عدلِ فاروقی کا ایک نمونہ، اظہار و قبول حق، جرأت صداقت، نظام حکومت اسلام، ہمارا طرز حکومت، عدل جہانگیری، خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کا انصاف، خواتین عرب کا ثبات و استقلال، اہلِ بیت کی زندگی وغیرہ کس قدر سبق آموز نظمیں ہیں۔ اس آخری نظم کے کچھ اشعار یہ ہیں:

افلاس سے تھا سیدۂ پاک کا یہ حال
گھر میں کوئی کنیز نہ کوئی غلام تھا

گھس گھس گئی تھیں ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں
چکی کے پیسنے کا جو دن رات کام تھا

سینے پہ مشک بھر کے جو لاتی تھیں بار بار
گو نور سے بھرا تھا مگر نیل فام تھا

آخر گئیں جناب رسولِ خدا کے پاس
یہ بھی کچھ اتفاق کہ واں اذن عام تھا

ارشاد یہ ہوا کہ غریبانِ بے وطن
جن کا کہ صفۂ نبوی میں قیام تھا

میں ان کے بندوبست سے فارغ نہیں ہنوز
ہر چند اس میں خاص مجھے اہتمام تھا

جو جو مصیبتیں کہ اب ان پر گزرتی ہیں
میں ان کا ذمہ دار ہوں میرا یہ کام تھا

کچھ تم سے بھی زیادہ مقدم ہے ان کا حق
جن کو کہ بھوک پیاس سے سونا حرام تھا

خاموش ہو کے سیدۂ پاک رہ گئیں
جرأت نہ کر سکیں کہ ادب کا مقام تھا

یوں کی ہے اہلِ بیت مطہر نے زندگی
یہ ماجرائے دخترِ خیر الانام تھا

مولانا اسماعیل میرٹھی رم۔ ۱۹۱۷ء) نے چھوٹی چھوٹی نظموں میں اخلاقی درس دیا ہے۔ "غصہ کا ضبط" ملاحظہ ہو (جو ایک حدیث سے ماخوذ ہے)

دل میں جب کوند جائے برق غضب — اور طبیعت ہو انتقام طلب
اس خطرناک راہ میں جو مرد — کر سکے آتش غضب کو سرد
ڈانٹ کر دیو نفس کو لے تھام — اور نہ لائے زباں پہ سخت کلام
مشورت عقل کی سنے اس دم — ہے وہی اپنے وقت کا رستم

"آزادی" کے متعلق لکھتے ہیں :

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر
تو وہ خوف و ذلت کے حلوے سے بہتر
جو ٹوٹی ہوئی جھونپڑی بے ضرر ہو
بھلی اس محل سے جہاں کچھ خطر ہو

اکبر الہ آبادی (م۔ ۱۹۲۱ء) کے کلام کا اکثر حصہ اخلاقیات سے متعلق ہے۔ انھوں نے مزاح کے ذریعے مخاطب کی دکھتی رگ کو پکڑا ہے اور کچھ ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ اسے نادم ہونا پڑتا ہے۔

چند منتخب اشعار یہ ہیں :

ترقی کی نئی راہیں جو زیر آسماں نکلیں
میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بی بیاں نکلیں

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جا کر

پارک میں کرتا ہے روز اسپیچ وفا
زاغ بن جائے گا اک دن آنریری عندلیب

پاؤں کانپا ہی کیے خوف سے ان کے ڈر پر
چست پتلون پہننے میں بھی پنڈلی نہ تنی

اپنے بھائی کے مقابل کبر سے تن جائیے
سامنا جب غیر کا ہو بس قلی بن جائیے

بغیر مزاح کے بھی اخلاقی اشعار لکھے ہیں۔ مثلاً،

پوچھتا ہوں جو میں عبرت سے مآل ہستی
راستہ گور و غریباں کا بتا دیتی ہے

موت سے غفلت جوانی میں تو لذت دے گئی
ہاں مگر پیری میں اس نے مجھکو رسوا کر دیا

سعی بازو سے کرے جو کسب زر
بس وہی اللہ کا مہمان ہے

خوش نصیبی زوال دنیا کی تعجب خیز ہے
چاہے جانے کے نہ تھی لائق مگر چاہی گئی

قناعت جس میں ہے وہ رزق پائے گا بحکم حق
سمجھ جس کو ہے اس کو بخش بیش و کم کیا مطلب

وحیدالدین سلیم (۱۹۲۸ء) نے بہت سی اخلاقی نظمیں لکھی ہیں۔
ایک نظم "پیغام عمل" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مثل پروانہ تم اک پل میں نہ جلنا سیکھو
تا سحر شمع کی مانند پگھلنا سیکھو

زندگی نام ہے حرکت کا، تم افسردہ نہ ہو
نبض کے خون کی مانند اچھلنا سیکھو

عزم جو دل میں ہو پورا تم اسے کر کے رہو
طفل سرکش بنو اور ضد سے مچلنا سیکھو

چشمۂ آب ہو تم سوتے اگا کر ابھرو
سنگ خارا کے شگافوں سے ابلنا سیکھو

آپ ہمت سے بھی مصیبت کی نہ کچھ خوف کرو
موم کی طرح ہر اک سانچے میں ڈھلنا سیکھو

مولانا محمد علی جوہر (م ۱۹۳۰ء) کے جوش اور ولولے کے قائل ہیں انھوں نے جا بجا عزم، حوصلہ، ایمان، بیداری اور قربانی وغیرہ کے مضامین سے اپنے کلام کو زینت بخشی ہے۔ مثلاً:

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

یہ نورِ حق کا ہے بجھائے نہ بجھے گا
کچھ دم ہے اگر تجھ میں تو تو بھی بجھا دیکھ

عزمِ عاشق ہے خود اپنی کامیابی کی دلیل
نام بھی لینا نہ ہرگز کوششِ برباد کا

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی
ہوسِ زیست ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی

جس کو دنیا نے نامراد کہا
وہی ناکام، کام کرتا ہے

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال (م ۱۹۳۸ء) کی پوری شاعری اسلام کی اخلاقی اقدار کا آئینہ ہے۔ خودی، خودشناسی، نیابت الٰہی، عمل، عشق، جگر کاوی، سخت کوشی، وغیرہ مضامین محض مسلمانوں کی بیداری کے لیے

ہیں اور ان مضامین سے اردو کو فخر و مباہات حاصل ہے۔ چند اشعار
ہی پیش کرنے کا موقع ہے :

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لبِ بام ابھی

صحبت پیر رومؒ سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سربجیب، ایک کلیم سربکف

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا کام
سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی، انگبین

چیتے کا جگر چاہیے، شاہیں کا تجسّس
جی سکتے ہیں بے روشنی دانش و فرہنگ

بالائے سر رہا تو ہے نام اس کا آسماں
زیرِ پر آگیا تو یہی آسمان، زمین

مولانا احسن مارہروی (م ۔ ۱۹۴۰ء) نے بچّوں کے لیے
"مثلثِ مثالؔ" لکھی اور چھوٹی چھوٹی اصلاحی نظمیں بھی لکھی ہیں۔
غزلوں میں بھی ایسے مضامین ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :

ناکارہ ہستیوں کی کیا زندگانیاں ہیں
ہاں کام کرنے والے جانِ جہانیاں ہیں
دنیا میں ہیں وہ شاداں، دنیا ہے ان کی خواہاں
کاموں پہ جن کے نازاں خود کامرانیاں ہیں

ہے جنسِ علم ارزاں سب کے لیے جہاں ہیں
قحطِ عمل سے لیکن ہم ہیں گرانیاں ہیں
اسباب ہیں میسّر، ساماں ہیں فراہم
کم ہمتی کی پھر کیوں ریشہ دوانیاں ہیں
کھیتوں کو دے لو پانی، اب بہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو، اٹھتی جوانیاں ہیں

حسرت موہانی رم۔ ۱۹۵۱ء) غزل کے بادشاہ ہیں لیکن انھوں نے کبھی کبھی سیاسی اور اخلاقی مضامین بھی نظم کیے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

اے کہ نجاتِ ہند کی دل سے ہے تجھ کو آرزو
ہمت سر بلند سے یاس کا انسداد کر
قول کو زید و عمرو کے حد سے سوا اہم نہ جان
روشنی ضمیر میں عقل سے اجتہاد کر
حق سے بہ عذرِ مصلحت وقت پہ جو کرے گزر
اس کو نہ پیشوا سمجھ، اس پہ نہ اعتماد کر
خدمتِ اہلِ جَور کو کر نہ قبول زینہار
فنّ و ہنر کے زور سے عیش کو خانہ زاد کر
غیر کی جد و جہد پر تکیہ نہ کر کہ ہے گناہ
کوششِ ذاتِ خاص پر ناز کر اعتماد کر

ظفر علی خاں رم۔ ۱۹۵۶ء) قوم اور ملک کے لیے عمر بھر تحریری اور تقریری جہاد کرتے رہے۔ اسلام کی شناخت، ایمان کی شناخت، رشتۂ اسلام، اللہ والے، اعظم الجہاد، نوائے سروش، ماں باپ کا ادب، اطاعت و استطاعت، آزادی وغیرہ بہت سے عنوانات کے تحت ہماری قوم کو درس دیا ہے اور قرآن و حدیث کو ماخذ بنایا ہے۔

ایک چھوٹی سی نظم "(ماں باپ کا ادب) ملاحظہ ہو :

اک دن نبیؐ نے حلقۂ احباب میں یہ لفظ
دہرائے تین بار کہ "ناک اس کی کٹ گئی"

اصحاب نے کہا کہ یہ کم بخت کون ہے
توقیر جس کی حضرتِ باری میں گھٹ گئی

ارشاد یوں ہوا کہ وہ فرزندِ ناخلف
گھر جس کے جنت آئی اور آ کر پلٹ گئی

ماں باپ کا جسے نہ بڑھاپے میں ہو خیال
اس نا سعید بیٹے کی قسمت الٹ گئی

پروفیسر ضیا احمد بدایونی (م۔ ۱۹۷۳ء) نے اخلاقی نظموں کے دو مجموعے تذکارِ سلف اور تجلیات شائع کیے تھے۔ خلق عظیم، رسول مقبولؐ کا تقویٰ، الفقر فخری، اقامت حدود اللہ، خلفاے راشدینؓ کا خلوص، عدلِ فاروقیؓ، مساواتِ اسلامی، حلمِ عثمانیؓ، عہد سلف کا ایک زریں صفحہ، سیرت مرتضویؓ، خلق حسنؓ وغیرہ عنوانات ہیں۔ ایک عنوان یہ ہے "اسباب یا مسبب الاسباب" اس کے ذیل میں یہ اشعار ہیں :

پہنچے جب ارضِ غرب کی آخر حدود تک
اسلام کے عساکرِ فیروز و فتح مند

حائل تھا ایک بحرِ پُر آشوب راہ میں
ہر موج جس کی قلۂ البرز سے بلند

موجود ناخدا تھا، نہ کشتی، نہ بدرقہ
کیوں ہوش باختہ نہ ہوں ایسے میں ہوش مند

دیکھا جو اپنی فوج کو خائف تو یک بیک
عقبہ نے بڑھ کے ڈال دیا بحر میں سمند

پاکر یہ فعل خارج از آہنگِ مصلحت
چھیڑا کسی رفیق نے یوں سازِ وعظ و پند
اے تیری ذات اہلِ فراست میں نامور
اے تیری رائے اہلِ بصیرت میں ارجمند
اسباب سے نہ چاہیے غفلت کہ یہ روش
ہے پیشِ عاقلانِ جہاں وجہ ریش خند
سن کر یہ حرفِ طعن، پکارا وہ سرفروش
اربابِ عزم کو نہیں یہ قول دل پسند
اسباب گو نہیں ہیں مسبب تو ساتھ ہے
سو در کھلے ہوئے ہیں اگر ایک در ہے بند

آج کے شاعروں میں حفیظ جالندھری بڑی خصوصیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے دین اور قوم کے لیے بہت کچھ لکھا ہے۔ "شہیدوں کی عید" کے عنوان سے لکھتے ہیں:

فرض پورا کر چکے، فرصت ملی ہر کام سے
مقبروں میں سو رہے ہیں آج کس آرام سے
صبح کی صورت اٹھے تھے رات کی آغوش سے
حال کے انوار چمکے تھے نقابِ دوش سے
ان کا اٹھنا تھا کہ تقدیرِ اخوت جاگ اٹھی
خوابِ غفلت میں پڑی تھی آدمیت جاگ اٹھی
ہو گئیں آباد ان کے نام سے آبادیاں
رشکِ جنت بن گئیں ان کے لہو سے وادیاں
بام و در، کہسار و میدان خشک و تر، پست و بلند
ہو گئے اللہ والوں کی صدا سے بہرہ مند

آخر ان کی عمر کا دن ڈھل گیا، شام آ گئی
یعنی صبح عید کا شب لے کے پیغام آ گئی

رات ان کی ہے کہ روز عیش کی تمہید ہے
ان شہیدوں کے لیے صبح قیامت عید ہے

لیکن اب ایسی شاعری کم ہوتی جا رہی ہے۔ شاید اس لیے کہ اخلاقی قدریں بدلی جا رہی ہیں، لیکن ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی قربانیاں انشاءاللہ رائیگاں نہیں جائیں گی اور ایک بار پھر اسلامی اقدار کو فروغ حاصل ہوگا۔

سیاسی شاعری:

جاگیر دارانہ نظام اور شخصی حکومتوں کے زیر اثر ہماری زبان نے ترقی کی۔ سیاسی بیداری اور اصلاحی شعور اسی لیے اس میں پیدا نہیں ہوا۔ سودا نے "شہر آشوب" قسم کی نظمیں ضرور لکھیں لیکن سیاسی بیداری ان کے یہاں بھی نہیں ہے۔ غالب کی شاعری بھی ملکی اور غیر ملکی حکام کی مدح سرائی ہے۔ بہادر شاہ ظفر اپنی کمزوری کا شکار ہوئے۔ انھوں نے کہا بھی ہے:

اعتبار صبر و طاقت خاک میں رکھوں ظفر
فوج ہندوستان نے کب ساتھ ٹیپو کا دیا؟

غالباً مومن (م۔ ۱۸۵۲ء) نے سب سے پہلے واضح طور پر سیاسی بیداری کا اظہار کیا ہے۔ وہ سید احمد بریلوی (م۔ ۱۸۳۱ء) سے بیعتِ جہاد کر چکے تھے گو کہ عملاً شرکت نہیں کی۔ وہ کہتے ہیں:

خدایا شکرِ اسلام تک پہنچا کہ آ پہنچا
لبوں پہ دم، بلا ہے جوشِ خوں شوقِ شہادت کا

ان کی جہادیہ مثنوی اس بیداری کی دلیل ہے۔ مومن کے بعد سرسید کی تعلیمی اور معاشرتی اصلاح بھی کسی نہ کسی طرح دین سے ضرور تعلق رکھتی تھی

اور ان کی وجہ سے شعر و ادب میں نئے نئے تجربات ہوئے۔ نذیر احمد (م - ۱۹۱۲ء) نے بھی سر سید کی ہم زبانی کی۔ ایک نظم میں کہتے ہیں :

عزیزو یہ عمل داری بڑی رحمت خدا کی ہے
غنیمت بس غنیمت جانو اس کے فضل بعید کو

حالی نے بھی حکومت برطانیہ کے گن گائے ہیں لیکن وہ اور ان کے رفقاء اپنے ملک کی بدامنی کے مقابلے میں اس حکومت کی امن پسندی ہی کو غنیمت سمجھ رہے تھے۔ شبلی ان رفقاء میں نسبتاً کم عمر تھے لیکن وہ مسلم لیگ کے مقابلے میں کانگریس کو زیادہ قرین صواب سمجھ رہے تھے۔ وہ اس طرح اس پہ طنز کرتے ہیں :

ع محسن قوم بھی ہے خادم حکام بھی

بہرحال علی گڑھ تحریک کے سب سے ممتاز شاعر حالی ہیں۔ ان کے مسدس اور شکوۂ ہند وغیرہ نظموں میں ایک واضح سیاسی شعور اور اسلامی قومیت کے احساس کا اندازہ ہوتا ہے۔

اسی زمانے میں اکبر الہ آبادی (م - ۱۹۲۱ء) کی شاعری کو قبول عام حاصل ہوا۔ وہ ابتدا میں اودھ پنچ والے شعراء کے گروہ میں شامل تھے۔ لیکن بعد میں ان کے خلوص نے انھیں (انگریز دشمنی کی وجہ سے) انگریز کے لائے ہوئے نظام کے خلاف آواز اٹھانے پر آمادہ کیا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :

وہ فقط وضع کے کشتہ ہیں نہیں ہیں کچھ اور
بھینس کو گون پہنا دیجیے عاشق ہو جائیں

لباس و اتحاد و دین و غیرت ایک نعمت ہے
نئی تہذیب کا یہ پیٹ ہے اب کہ مٹکا ہے

طریق مغربی کیا یہی روشن ضمیری ہے
خدا کو بھول جانا اور محوِ ماسوا ہونا

حکم برٹش کا، ملک ہندو کا
اب خدا ہی ہے بھائی صدو کا

مرعوب ہو گئے ہیں ولایت سے شیخ جی
اب صرف منع کرتے ہیں دیسی شراب کو

اسی ماحول میں حسرت موہانی (م۔ ۱۹۵۱ء) نے آنکھ کھولی۔ علی گڑھ سے انھوں نے ۱۹۰۳ء میں بی۔ اے پاس کیا اور کم و بیش اسی زمانے سے شاعری شروع کی۔ محبت اور سیاست سے ان کی زندگی عبارت تھی اور انھی دو چیزوں نے ان کی شاعری کو بامِ عروج پر پہنچایا۔ وہ کانگریس میں بھی رہے اور مسلم لیگ میں بھی، لیکن ان کی حق گوئی کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے رہنما یا انگریز حاکم کو بھی وہ بخشتے نہیں تھے۔ انگریز نے بھی اسی وجہ سے انھیں نہیں بخشا اور ہر موقع پر انھیں قید میں رکھا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کٹ گیا قید میں ماہِ رمضاں بھی حسرت
گرچہ سامان سحر کا تھا، نہ افطاری کا

ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

نام ہے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا ستم
جبر بہ زیرِ نقاب دیکھیے کب تک رہے

ہے جنھیں شوقِ شہادت انھیں کیا خوف بھلا
قید کا مرحلۂ رزم اگر ہو درپیش

غضب ہے کہ پابندِ اغیار ہو کر
مسلمان رہ جائیں یوں خوار ہو کر

مولانا محمد علی جوہر (م۔ ۱۹۳۰ء) جوش اور عمل کا مجسمہ تھے اور بے حد جذباتی تھے۔ وہ بھی دین کی حمایت میں عمر بھر لڑتے[1] رہے۔ ان کے چند اشعار یہ ہیں:

پوچھتے کیا ہو بود و باش کا حال
ہم ہیں باشندے جیل خانے کے
قید میں اور اتنی بیباکی
سب یہ پھل ہیں مار کھانے کے

ملی ہے قید آزادی کی خاطر — نہ پڑ جائیں کہیں دونوں کے چسکے

نہیں پالا پڑا قاتل تجھے ہم سخت جانوں سے
ذرا ہم بھی تو دیکھیں تیری جلادی کہاں تک ہے

---

[1] علی برادران کی خلافت تحریک سے متعلق مرزا طاہر بیگ مراد آبادی کی یہ نظم بہت مشہور ہوئی۔ بولیں اماں محمد علی کی — جان بیٹا خلافت پہ دیدو

تجھے ہے قوت بازو پہ غرہ صبر پہ ہم کو
لگا دے زور تو سارا تری طاقت جہاں تک ہے

اسی زمانے میں علامہ اقبال (م۔ ۱۹۳۸ء) بھی تھے جنھوں نے ۱۳ر اپریل ۱۹۱۹ء کے جلیاں والے باغ کا دردناک واقعہ بھی دیکھا تھا:

ہر زائرِ چمن سے یہ کہتی ہے خاکِ باغ
غافل نہ رہ جہان میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خونِ شہیداں سے اس کا تخم
تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

اور انھوں نے خالص اسلامی سیاست کو پیش نظر رکھ کر ۱۹۳۰ء میں ایک علیحدہ اسلامی وطن (پاکستان) کی تجویز پیش کی تھی اور قائد اعظم محمد علی جناح (م۔ ۱۹۴۸ء) کو اپنے مکاتیب میں اپنے نظریات سے آگاہ کیا تھا۔

وہ ضرب کلیم میں "شعاعِ امید" نظم میں کہتے ہیں:

اک شوخ کرن، شوخ مثالِ نگہِ حور
آرام سے فارغ صفتِ جوہرِ سیماب
بولی کہ مجھے رخصت تنویر عطا ہو
جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہاں تاب
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب

مذکورہ بالا گروہ کے ایک سرگرم سیاست داں اور عالم ہمہ داں مولانا ظفر علی خاں (م۔ ۱۹۵۶ء) بھی تھے انھوں نے تحریر و تقریر میں ہر وقت اسلام کی خدمت کرنی چاہی۔ انھوں نے ملکی اور قومی سیاست پر بکثرت نظمیں لکھیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

زندگی ان کی ہے دین ان کا ہے دنیا ان کی ہے
جن کی جانیں قوم کی عزت پہ قربان ہو گئیں

ہم حق کے علمبرداروں کا اب بھی ہے نرالا ٹھاٹھ وہی
بادل کی گرج تکبیروں میں، بجلی کی چمک تلواروں میں

اگر تم کو ہے حق سے کچھ بھی لگاؤ
تو باطل کے آگے نہ گردن جھکاؤ

زندۂ جاوید ہے اللہ والوں کا گروہ
امتِ مرحوم ہو سکتی ہے مر سکتی نہیں [1]

ہندوستان سے پاکستان کی ۱۹۶۵ء کی جنگ، مجاہدانہ عزائم کے ساتھ ہوئی۔ اس موقع پر پاکستان میں بہت سی نظمیں لکھی گئیں۔ چند نظموں کے مصرعے ان کی مقبولیت کی وجہ سے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

؎ ضمیرِ جہاں جاگ جاگ، اب تو جاگ (جسٹس ایس اے رحمان)

؎ اے دیارِ پاک تیری سرزمیں (عبدالعزیز خالد)

---

[1] جگر مراد آبادی (م ۱۹۶۰ء) نے بھی بھارت کی سیاست پر کئی غزلیں اور نظمیں لکھی تھیں۔ یہ غزل بہت مشہور ہے۔

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

ان کا ایک گیت بھی بہت مشہور ہے۔

بھاگ مسافر میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ
اوپر اوپر پھول کھلے ہیں بھیتر بھیتر آگ

ع چاند اس رات بھی نکلا تھا مگر اس کا وجود (احمد ندیم قاسمی)
خطۂ لاہور تیرے جاں نثاروں کو سلام (رئیس امروہوی)
" میں پاکستان ہوں میرے جوانوں میرے کام آؤ (حفیظ جالندھری)
" مجاہدین صف شکن بڑھے چلو بڑھے چلو (احسان دانش)
" میرے نغمے تمھارے لیے ہیں (جمیل الدین عالی)
" ہم صداقت کے امیں ہم ہیں غلامانِ رسولؐ (ظہیر کاشمیری)
" میرا سب کچھ مرے وطن کا ہے (شورش کاشمیری)
" حریف اپنے حریفانِ ناسزا نکلے (نعیم صدیقی)
" زندہ باد اے چین و انڈونیشیا (حبیب جالب)
" لام پر آتے تو لارام (سید ضمیر جعفری)
" ہم ہیں محافظ اپنے وطن کے (اسکواڈرن لیڈر صفدر)
" اے مرد مجاہد ترا اللہ نگہبان (محترمہ خاور درانی)
" پاکستانی بڑے لڑیا جن کی سہی نہ جائے مار (نفیس الدین فریدی بدایونی)

آج کے شعراء میں شورش کاشمیری (م۔ ۱۹۷۵ء) کو امتیازی اہمیت حاصل ہے۔ ان کا ہفت روزہ اخبار" چٹان خود ان کی طرح قید و بند کی منزلوں سے گزرتا رہتا ہے۔ اب ان کے صاحبزادے مسعود شورش اسی اخبار کو "ستارۂ صبح" کے نام سے شائع کر رہے ہیں۔ شورش مرحوم بھی علی گڑھ تحریک سے وابستہ تھے اور بعد میں خالص اسلامی شاعر بن گئے تھے اور ہر وقت سیاست پر کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہتے تھے۔ "تخت یا تختہ" کے عنوان کے ذیل میں لکھتے ہیں:

جو تمھارے جی میں آئے جانِ جاں بے شک کرو
ہم کسی ڈر سے سپر انداز ہوں، ممکن نہیں

ہم نے جو کچھ بھی کہا تقریر اور تحریر میں
لفظ و معنی اس خزینے کے ہیں دربانِ یقیں

خوفِ غیر اللہ دل میں ہو تو یہ ہے کافری
جھک نہیں سکتی کسی شداد کے آگے جبیں

تخت یا تختہ پہ جب رکھی گئی اپنی نہاد
ہم کسی حجاج بن یوسف سے ڈر سکتے نہیں

پاؤں کی ٹھوکر پہ رکھتا ہوں جلال خسروی
میرے آقا، میرے مولا، رحمۃ للعالمینؐ

حبیب جالب بھی حبس اور حبسیات کا بہت تجربہ رکھتے تھے۔ ایوب خاں کے دورِ حکومت میں بھی وہ بہت سختیاں جھیل چکے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

فرضی مقدمات ہیں جھوٹی شہادتیں
ہم پھر بھی لکھ رہے ہیں جنوں کی حکایتیں

مجرم کی اب نشان دہی کون کر سکے
اب تک ہیں بند اہلِ قلم کی عدالتیں

زنجیرِ پا جو توڑ رہے ہیں قفس نصیب
ہیں اہل آشیاں کی نظر میں بغاوتیں

جو لوگ جھونپڑوں میں پڑے سو تھے پڑے رہے
کچھ اہلِ زر نے اور بنا لیں عمارتیں

آیا ہی چاہتا ہے اب اہلِ خرد کا دور
مسند نشیں رہیں گی کہاں تک جہالتیں

شروع مارچ ۱۹۷۷ء سے مسلسل تین سوا تین ماہ تک کشت و خون اور قید و بند کا جو سلسلہ پاکستان میں رہا ہے اس موقع پر حبیب جالب نے یہ غزل کہی ہے:

دلوں پہ فتح کسی نے بہ جبر بھی پائی؟
ہزار بار ہنسی اہلِ جور پر آئی

نیا نہیں ہے ہمارے لیے قفس یارو
جنوں کی لہر ادھر ہم کو بارہا لائی

بجا کہ جسم کو زنداں میں قید کر دوگے
مگر خیال کو زنجیر کس نے پہنائی

کسی سے اپنے لیے ہم نے کچھ نہیں مانگا
یہ اور بات کہ کس سے نہ تھی شناسائی

لہو لہو جو ہمارا ہے گلستاں جالب
یہ کس کے دستِ ستم کی ہے کارفرمائی

ان کے علاوہ بہت سے شعراء ایسے بھی ہیں جو مستقل طور پر نہیں لکھتے لیکن ماحول کی آواز تو ضرور رہیں اور کچھ نہ کچھ سیاست پر بھی لکھتے رہتے ہیں[۱]:

مرثیہ نگاری: مرثیہ نگاری میں میر اور سودا کے بعد صابر، رخشاں، میر ضاحک اور ان کے بیٹے میر حسن (م۔ ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶ء) پھر ان کے بیٹے میر خلیق (م۔ ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء) خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ میر خلیق کے بیٹے میر انیس (۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء) نے اس فن کو سب سے زیادہ ترقی دی لیکن ان کے ہم عصر میر ضمیر نے مرثیہ میں چہرہ (مرثیے کی تمہید) اور سراپا کو مستقل جگہ دی اور رزمیہ مضامین مثلاً جنگی ساز و سامان تلوار اور گھوڑے وغیرہ کے شاعرانہ اوصاف بھی شامل کیے۔ واقعہ نگاری

---

[۱] یہاں تک ۵ر جولائی ۱۹۷۷ء کے "انقلاب پاکستان" سے پہلے لکھا گیا تھا۔ غلام مصطفیٰ خان۔

اور محاکات کو بھی اختیار کیا۔ منبر پر بیٹھ کر تحت اللفظ پڑھنے کی جدت بھی انھی کی ایجاد ہے۔

میر خلیق کے بیٹے انیس نے اردو مرثیے کو ہر لحاظ سے گراں قدر بنایا۔ روزمرہ، محاورہ، حسن ادا، جذبات نگاری، منظر نگاری مختلف صنائع و بدائع اور بکثرت اخلاقی مضامین کی وجہ سے ان کا مرثیہ سب پر غالب رہا ہے۔

مرزا دبیر (م۔ ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء) کے یہاں بھی جذبات نگاری اور منظر نگاری انیس سے کم نہیں لیکن ان کے یہاں انیس کے برخلاف شوکت الفاظ زیادہ ہے۔ ان کے بیٹے مرزا اوج بھی اچھے مرثیے کہتے تھے۔ انیس کے بیٹوں میں نفیس صحیح طور پر ان کے جانشین کہلائے گئے۔ ۱۳۱۸ھ/ ۱۹۰۱ء میں انتقال کیا۔ انیس کے بھتیجے وحید (م۔ ۱۳۰۸ھ/ ۱۸۹۱ء) بھی اچھے مرثیے لکھتے تھے اور نفیس کے نواسے عارف (م۔ ۱۳۳۴ھ/ ۱۹۱۶ء) بھی اس فن میں کمال رکھتے تھے۔

لکھنؤ کے ایک اور خاندان سے پیارے صاحب رشید (م۔ ۱۳۳۶ھ/ ۱۹۱۷ء) بھی ایک باکمال مرثیہ نگار ہوئے ہیں اور شاید انھی کی وفات سے مرثیے کا کمال بھی ختم ہوگیا۔ آج بھی مرثیے لکھنے والے مل جاتے ہیں لیکن انھوں نے کوئی امتیازی بات پیدا نہیں کی۔

یہاں بے محل نہ ہوگا اگر جناب عزیز جے پوری (جو آج کل کراچی میں ہیں) کے ان مرثیوں کا ذکر بھی کر دیا جائے جو انھوں نے صحابہ

لے یہاں انیس اور دبیر کے مرثیوں کے نمونے پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کیونکہ وہ بہت مشہور ہیں۔ ان کے محاسن کلام کے لیے مولانا شبلی کی کتاب "موازنہ انیس و دبیر" اور مولانا حامد حسن قادری کی کتاب "تاریخ مرثیہ گوئی" ملاحظہ فرمائیں۔

کرام رضی اللہ عنہم کی شہادت پر لکھے ہیں۔ حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت پر ۱۶۵ بند لکھے ہیں۔ چند یہ ہیں:

لو اہلِ بزم، مردِ نبرد آزما گرا — اہلِ ولا، وہ ضیغمِ دشت وغا گرا
فرشِ زمیں پہ ہے فلکِ العرش آ گرا — وا حسرتا، معاونِ شیرِ خدا گرا
عمِ رسولِ پاک جو یوں خاک پر گرے
کیوں آسماں نہ ہر دلِ غمناک پر گرے

پہلو میں کارگاہِ غمِ دل خراش ہے — دل ٹکڑے ٹکڑے ہے تو جگر پاش پاش ہے
سینے میں دل نہیں ہے کوئی غم کی قاش ہے — کہتا ہے جوشِ گریہ کہ اب راز فاش ہے
بے ضبط ہو گیا ہوں غمِ جاں گداز سے
فریاد ہے خدائے نشیب و فراز سے

افسوس اے قتیلِ جفا، اے فدائے دیں — ہیہات اے شہیدِ وفا، مبتلائے دیں
صد حیف اے حریفِ قضا، رہنمائے دیں — ہے ہے امیرِ فوجِ خدا، پیشوائے دیں
کیا کم کیے تھے فوجِ ستم گار نے ستم
توڑے ہیں اور ہندِ جگر خوار نے ستم [1]

اسی طرح دوسرے صحابۂ کرام رضی (شہداء) کے مرثیے بھی ہیں۔

اخبار اور رسالے: شروع شروع میں اردو اخباروں اور رسالوں میں مضامین کے لحاظ سے کوئی زیادہ فرق نہ تھا۔ اخباروں میں بے شک خبریں زیادہ ہوتی تھیں لیکن ادبی مضامین کے ساتھ ساتھ دینی مضامین بھی آ جاتے تھے بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ کوئی اخبار دین سے خالی نہیں تھا۔ اسی طرح ادبی رسالے بھی دینی مضامین سے خالی

---

[1] ادب عزیز۔ حصہ دوم۔ جزو ۲۔ صفحہ ۳۱، ۳۲ (کراچی، ۱۹۶۷ء)۔

نہیں ہوتے تھے اور خاص خاص خبریں ان میں بھی ہوا کرتی تھیں۔ چنانچہ محمد حسین آزاد کے والد محمد باقر کا دہلی اردو اخبار جو ۱۸۳۶ء میں جاری ہوا اس میں بھی لطیف انداز میں انگریز اور نصرانیت کی مخالفت ہوا کرتی تھی۔ یہی چیز سر سید کے بڑے بھائی سید محمد کے سید الاخبار (۱۸۳۹ء) میں بھی تھی کہ اس میں بھی نصرانیت کے خلاف اور دین اسلام کی حمایت میں مضامین ہوا کرتے تھے۔

مولوی اکرام علی نے کلکتہ سے اردو اخبار ۱۸۱۰ء میں نکالا تھا۔ اس سے پہلے ہی یعنی ۱۸۰۲ء میں فورٹ ولیم کالج والوں[1] نے اردو ٹائپ کا مطبع قائم کر لیا تھا۔ انگریز پادریوں نے شیورام (سیرام پور بنگال) میں ایک اور مطبع قائم کیا۔ جہاں پادری مارٹن کی انجیل (عہد نامۂ جدید) کا اردو ترجمہ پانچ جلدوں میں ۱۸۱۶ء سے ۱۸۱۹ء تک شائع ہوا۔ اسی زمانے میں لکھنؤ میں ٹائپ کا مطبع قائم ہوا۔ پھر ۱۸۳۰ء میں لیتھو کا مطبع (سنگی) کانپور میں قائم ہوا اور ایسا ہی مطبع کچھ عرصے کے بعد لکھنؤ میں قائم ہوا۔ ۱۸۳۲ء میں اردو کو سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ ۱۸۳۵ء میں اخباروں کو آزادی ملی۔ ۱۸۳۷ء میں دہلی میں بھی ٹائپ کا لیکن لیتھو کے چھاپے خانے تمام ہندوستان میں قائم ہونے لگے اور ۱۸۴۹ء میں صرف شمالی مغربی صوبوں میں (یعنی موجودہ یوپی، دہلی اور پنجاب میں) ۳۴ چھاپے خانے قائم ہوئے اور ان مقامات سے ۲۳ اخبار شائع ہونے لگے اور اسی سال پورے ملک کے اخباروں اور رسالوں کی تعداد پچاس ہو گئی۔ پھر ۱۸۵۸ء میں مطبع نولکشور قائم ہوا اور اس کا اودھ اخبار بھی اسی سال جاری ہوا جو ہفتہ واری تھا

[1] محمد عتیق صدیقی نے "گل کرسٹ اور اس کا عہد" (علی گڑھ ۱۹۶۰ء) کے صفحہ ۳۶ میں لکھا ہے کہ یہ مطبع خود گل کرسٹ کی ملکیت میں تھا۔

اور بعد میں روزانہ ہو گیا[1]

محمد باقر کا دہلی اردو اخبار اور سرسید کے بھائی سید محمد کا سید الاخبار اور بند کو رہوا۔ ان کے علاوہ دہلی سے ۱۸۳۹ء میں سراج الاخبار جاری ہوا۔ پھر آگرہ سے خالص دینی اخبار قطب الاخبار کے نام سے جاری ہوا جس میں احادیث کے ترجمے اور بزرگان دین کے حالات ہوا کرتے تھے۔ شیخ عبداللہ کا شملہ اخبار، محمد علی کا نور علی نور (لدھیانہ)[2] نصیر الدین کا مارتنڈ اخبار (ہندی، اردو، بنگالی، فارسی اور انگریزی پانچ زبانوں میں) بھی اسی زمانے سے متعلق ہیں۔ پھر مولوی منظور کا منظور الاخبار (سورت ۱۸۶۰ء) مولوی عزیز الدین کا امین الاخبار (الہ آباد) محمد قاسم کا قاسم الاخبار (بنگلور ۱۸۶۱ء)۔ محمد علی مراد کا راجپوتانہ (۱۸۶۴ء)۔ فاروق حسن کا دبدبۂ سکندری (رام پور ۱۸۶۷ء)۔ منظفر حسین کا برق خاطف (بمبئی ۱۸۶۸ء)۔ اخبار انجمن پنجاب (۱۸۷۰ء)۔ سرسید کا رسالۂ تہذیب الاخلاق (۱۸۷۰ء)۔ راجہ محمد ہاشم کا کارنامۂ ہند (سوہنہ ضلع گڑگانو) نادر علی سیفی کا کوہ نور (۱۸۷۰ء)۔ منشی محمد دین کا اخبار الاخیار (دہلی

---

[1] بعض اخبار ہفتہ واری تھے تو روزانہ ہو گئے۔ بعض بند ہو کر پھر جاری ہو گئے۔ بعض ماہانہ بن گئے۔ اس لیے بالکل صحیح صحیح زمانہ اور کیفیت عرض نہیں کی جا سکتی۔ اخباروں اور رسالوں کے متعلق امداد صابری کی کتاب "فرنگیوں کا جال" (صفحہ ۱۰۰ تا ۱۰۶) اور داستان تاریخ اردو (۱۹۴۱ء) کے صفحہ ۸۶ ۲۶۸ ملاحظہ ہوں۔

[2] نور علی نور ماہانہ رسالہ سیالکوٹ سے بھی منشی دیوان چند کے اہتمام سے جنوری ۱۸۵۶ء سے جاری ہوا (راقم الحروف کے پاس ہے) فروری کے رسالے میں منشی احمد علی خاں وجاہت نے ایک قطعۂ تاریخ شائع کیا جس کا تاریخی مصرع یہ ہے۔ "مبارک نام شد نور علی نور" ۱۲۷۲ھ۔

عبدالحلیم شرر کا رسالہ دلگداز (لکھنؤ ۱۸۸۷ء) ابلاغ
(لاہور ۱۸۹۳ء) شیخ عبدالحلیم ... (حیدر آباد دکن ۱۸۸۹ء)۔ نور الانوار (کانپور
۱۸۹۶ء)۔ محمد حسین کا رسالہ حسن ... نور الاسلام سیالکوٹ ۱۹۰۰ء
(۱۸۹۹ء)۔ نسیم (آگرہ ۱۸۹۸ء)۔
دیوبند سے (۱) رسالہ تجلی (۲) القاسم (۳) الرشید۔ محمد سعید و
عبدالمجید بنارسی کا رسالہ نصرۃ السنۃ (بنارس ۱۳۰۰ھ سے جاری ہوا تھا)۔
پھر بیسویں صدی کے آغاز سے ان اخباروں اور رسالوں کی شہرت
ہوئی:

مولانا عبدالشکور فاروقی کا رسالہ النجم۔ مرزا ہادی عزیز لکھنوی کا
دو ہفتہ اخبار اتفاق (کانپور)۔ مولانا ظفر علی خاں کا اخبار زمیندار (لاہور)
تاج الدین کا اخبار تاج (جبل پور)۔ رسالہ مونس (جبل پور)۔ جگنو خاں
رحیم کا رسالہ گل (لکھنؤ)[2]۔ محمد حسین بٹالوی (المتوفی ۱۳۳۸ھ /
۱۹۲۰ء) کا رسالہ اشاعۃ السنۃ (بٹالہ ضلع گورداسپور)۔ ضیاء الرحمن
دہلوی کا رسالہ ضیاء السنۃ (کلکتہ)۔ محمد ابراہیم کا رسالہ الہادی (سیالکوٹ)
مولانا ثناء اللہ امرتسری (م ۱۳۶۷ھ / ۱۹۴۸ء) کا ہفتہ وار مسلمان
(امرتسر) اور ان کا ماہانہ رسالہ مرقع قادیان (امرتسر)۔ محمد یوسف شمس
کا رسالہ اہل الذکر (فیض آباد)۔ محمد داؤد غزنوی کا ہفتہ وار توحید
(امرتسر) مولانا ابوالکلام کا ہفتہ وار الہلال (۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۴ء تک) اور
انہی کا ہفتہ وار البلاغ (۱۹۱۳ء میں صرف تین ماہ)۔ محی الدین احمد کا

---

[1] انجمن حمایت اسلام کے پاس اس زمانے میں اخباروں میں سے رفیق
ہند، صحیفہ، قدسی سراج الاخبار (جہلم) اور الصدیق آیا کرتے تھے اور رسالوں
میں اشاعۃ السنۃ، حامی ہند، الواعظ آیا کرتے تھے۔ دیکھیں امداد صابری
کی کتاب "فرنگیوں کا جال" صفحہ ۲۰۰۔ [2] جگنو خاں رحیم ایک ادبی رسالہ
پیام عاشق بھی قنوج سے نکالا کرتے تھے۔

روزنامہ اقدام (کلکتہ، دینی اور سیاسی)۔ احمد اللہ کا ماہانہ رسالہ تبلیغ اسلام
(دہلی، جولائی ۱۹۲۲ء سے ایک سال تک۔ عبدالغنی کا رسالہ النذیر (چک
رجادہ، لالہ موسیٰ) عبدالمجید حمید کا رسالہ نظارہ (میرٹھ، ۱۹۱۶ء سے
پانچ سال تک) خواجہ حسن نظامی کا رسالہ نظام المشائخ (دہلی) مولانا
شبلی کے ایما پر مولانا سلیمان ندوی کا معارف (اعظم گڑھ) جو ۱۹۱۶ء سے
اب تک جاری ہے۔ صاحبزادہ ارجمند محمد خان سلیم کا رسالہ نیرِ منیر (بھوپال
ادبی و دینی)۔ دہلی کے رسالے (۱) مولوی (۲) پیشوا (۳) منادی۔
(۴) ندائے حرم۔ لکھنؤ کے رسالے (۱) الندوہ (۲) الناظر (ادبی و
دینی، از ظفر الملک) (۳) الفرقان مولانا منظور نعمانی۔ مولانا ثناء اللہ
امرتسری کا مزید ایک ہفتہ وار اخبار اہلِ حدیث (امرتسر)۔ مولوی
محمد جوناگڑھی کا پندرہ روزہ محمدی (دہلی، ۱۹۲۱ء سے جاری ہے)
عبدالرزاق ملیح آبادی کا روزانہ و ہفتہ وار ہند جدید (کلکتہ) عبیداللہ
مبارک پوری کا رسالہ محدث (دہلی) عبیدالرحمٰن عمر پوری کا رسالہ ریاضِ
توحید (دہلی)۔ عبدالحنان بہاری کا رسالہ اہلِ حدیث گزٹ (دہلی)۔
عبدالمجید خادم کا رسالہ مسلمان (لاہور)۔ سوہدرہ سے ۱۹۲۰ء میں جاری ہوا تھا۔
عبدالحفیظ گیاوی کا رسالہ مجلہ سلفیہ (دربھنگہ، بہار، ۱۹۳۴ء سے)
عبدالمجید قریشی کا ایمان (پٹی، لاہور)۔ مولانا اشرف علی کا رسالہ النور
(تھانہ بھون)۔ عمر آباد (مدراس) سے رسالہ مصحف اور حافظ عبداللہ
کا ہفتہ وار تنظیم اہلِ حدیث (روپڑ، انبالہ) محمد اسحاق حنیف کا ہفتہ وار
مبلغ (لاہور)۔ مولانا محمد یوسف بنوری کا رسالہ بینات (کراچی)۔ مولانا
ابوالاعلیٰ مودودی کا ترجمان القرآن (پٹھان کوٹ اور لاہور) مولانا
عبدالماجد دریابادی کا اخبار صدقِ جدید (لکھنؤ) غلام احمد پرویز کا
رسالہ طلوعِ اسلام (لاہور)، پہلے کراچی سے شائع ہوتا تھا۔ عبدالغفار

ملتی کا پندرہ روزہ صحیفہ اہلِ حدیث (کراچی)، ۱۳۴۰ھ سے دہلی سے شائع ہوتا تھا۔ حافظ عبدالقادر روپڑی کا ہفتہ وار تنظیم اہلِ حدیث۔ (لاہور)، عطاء اللہ حنیف کا ہفتہ وار الاعتصام (لاہور) مولانا محمد داؤد راز کا پندرہ روزہ نورِ ایمان (دہلی) حافظ احسان الٰہی کا رسالہ اہلِ حدیث (لاہور) عبدالجلیل رحمانی کا رسالہ مصباح (بستی، یو۔پی)، عبدالسلام بستوی کا رسالہ الاسلام (دہلی)، ابوبکر غزنوی کا ہفت روزہ توحید (لاہور)، اب بند ہے، جمعیت اہلِ حدیث کا رسالہ الارشاد (کراچی)، عطاء اللہ حنیف کا رسالہ رحیق (لاہور)، اب بند ہے، المعارف (لاہور)، فکرونظر (اسلام آباد)، برہان (دہلی)، رشاد (سیالکوٹ)، اب بند ہے، شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدرآباد (سندھ) کا رسالہ الرحیم (اب الولی)، ذہین شاہ کا رسالہ تاج (کراچی)، البقاء (کراچی)، رسالہ سیارہ (لاہور)، اسلامی تعلیم (لاہور)، خدام الدین (لاہور)، الحق (اکوڑہ خٹک۔ سرحد)، فاران (کراچی۔ ادبی و دینی)، المیزان (بمبئی) وغیرہ کتنے رسالے اور اخبار ہیں جو دین کی خدمت کرتے ہیں،

ان کے علاوہ بکثرت مطابع نے جنگ آزادی سے پہلے اور اب بھی دینی کتابوں کی اشاعت[1] کا کام کیا ہے اور وہ برابر جاری ہے، بہرحال اس سرسری جائزے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اردو میں دینی ادب کس قدر حاوی ہے بلکہ پورے ادب پر وہ غالب ہے[2]

ع ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

---

[1] مطابع کی خدمات کے لیے پروفیسر محمد ایوب قادری کا مقالہ "اردو میں مذہبی ادب" (اردو نامہ کراچی، شمارہ ۵۱) دیکھیں۔

[2] عربی اور دین کے اثرات کے لیے راقم الحروف کا مضمون "ہمارا معاشرہ اور عربی" (پاکستان میں فروغ عربی، کراچی یونیورسٹی ۱۹۷۵ء) دیکھیں۔

کتابیات

مختلف دواوین اور کلّیات کے علاوہ حسب ذیل کتابیں
پیشِ نظر تھیں،

ابو یحییٰ امام نوشہروی (مولانا) ہندوستان میں اہل حدیث کی
خدمات، چیچا وطنی ۱۹۷۱ء
افسر صدیقی امروہوی (مولانا)، شہاب تخیل، کراچی ۱۹۳۹ء،
امداد صابری، فرنگیوں کا جال، دہلی ۱۹۵۰ء،
حامد حسن قادری، (پروفیسر) داستانِ تاریخ اردو، آگرہ ۱۹۴۱ء،
حبیب الحق ندوی، (ڈاکٹر) پاکستان میں فروغ عربی، کراچی ۱۹۷۵ء،
ریاض خیر آبادی، ریاض رضوان حیدرآباد دکن ۱۹۳۸ء،
سخی احمد ہاشمی، (ڈاکٹر) شبلی کا ذہنی ارتقاء (قلمی)،
سعادت یار خاں رنگیں تصنیف رنگین (مثنوی)، قلمی، مخزونہ
راقم الحروف)
سیماب اکبر آبادی ساز و آہنگ آگرہ ۱۹۴۱ء،
سیماب اکبر آبادی کار امروز آگرہ ۱۹۴۷ء،
ضیاء احمد بدایونی (پروفیسر) تجلیات، دہلی ۱۹۵۲ء
عبدالحق (ڈاکٹر) قاموس الکتب جلد
اول، کراچی ۱۹۶۱ء،

شعر الہند حصہ دوم
عبدالسلام ندوی (مولانا)
اعظم گڑھ ۱۹۵۴ء (طبع چہارم)
عبدالقدوس ہاشمی (مولانا) تقویم تاریخی، کراچی ۱۹۶۵ء
عزیز جیپوری ادب عزیز کراچی ۱۹۶۷ء
غلام سرور لاہوری (مفتی) دیوانِ حمد ایزدی
لکھنؤ (سال ندارد)،
غلام مصطفٰے خان (ڈاکٹر) تحریر و تقریر، حیدر آباد ۱۹۶۲ء
" تحقیقی جائزے، سکھر ۱۹۶۸ء
" علمی نقوش، کراچی ۱۹۵۷ء
فتح محمد پانی پتی (قاری)، شرح شاطبیہ جلد اول، کراچی ۱۹۵۴ء
محمد احمد رضوی (مولانا)، فلسفۂ شریعت اسلام (ترجمہ) لاہور ۱۹۵۵ء
محمد ایوب قادری (پروفیسر)، تذکرۂ علمائے ہند، کراچی ۱۹۶۱ء
محمد حسن ٹونکی (مولانا)، السنۃ و مکانتھا (ترجمہ)
محمد عتیق صدیقی گل کرسٹ اور اس کا عہد، علی گڑھ ۱۹۶۰ء
محمد مسعود احمد (ڈاکٹر) قرآنی تراجم و تفاسیر (مقالہ، قلمی)
نصیر الدین ہاشمی، دکنی کے چند تحقیقی مضامین، دہلی ۱۹۶۳ء، وغیرہ
وغیرہ جرائد و رسائل ان کے علاوہ ہیں۔

اُردو میں احادیث کے محاورے[1]

اللہ پاک کا بے حد شکر و احسان ہے کہ اس نے انسان کو قوت گویائی عطا فرمائی اور اپنے کلام، نیز اپنے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے ذریعے اُسے بات کرنے کا سلیقہ سکھایا۔ یعنی قرآن و حدیث کے بے شمار الفاظ اور محاورات نے عرب اور غیر عرب ملکوں میں فصاحت اور بلاغت کو چار چاند لگائے اور وہاں کے ادب کو صحیح معنی میں "ادب" بنایا۔

برصغیر پاک و ہند میں چوں کہ فارسی بولنے والوں میں ہماری اُردو زیادہ رواج پذیر رہی ہے اس لیے اس زبان میں وہ عربی الفاظ و محاورات بھی داخل ہوئے جو فارسی میں رائج ہو چکے تھے اور وہ بھی شامل ہوئے جو عربی کے علما اور فضلا نے براہ راست اپنی تقریر و تحریر کے ذریعے عام کیے۔ چنانچہ انھی بزرگوں کے قلم سے اردو میں ایسی کتابیں ہزاروں کی تعداد میں نکلی ہیں جن کا تعلق گو کہ دین سے نہیں ہے لیکن وہ دین سے بے تعلق بھی نہیں ہیں۔

---

[1] "اردو میں قرآن اور حدیث کے محاورات" پر ایک مستقل کتاب ۱۹۸۰ء میں اسلام آباد سے شائع کر دی گئی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ان کتابوں میں عربی کے بکثرت اقوال، محاورات اور ضرب الامثال کی شکل میں درج ہیں چند مثالوں سے اس کی وضاحت ہو سکے گی۔

عربی کے بعض اقوال اور ضرب الامثال ایسے ہیں جو فارسی میں بھی مستعمل ہیں۔ مثلاً:

۱۔ اَلْعِیَانُ لَا یَحْتَاجُ اِلَی الْبَیَانِ — عیاں را چہ بیان
۲۔ اَلدَّ اَبْتَہُ الْجَارُ — اوّل خویش بعدہ درویش
۳۔ اَلْبَلِیَّۃُ اِذَا عَمَّتْ طَابَتْ — مرگ انبوہ جشنے دارد
۴۔ اِذَا حَضَرَ الْمَاءُ بَطَلَ الْتَیَمُّمُ — آب آمد تیمم برخاست
۵۔ اِنَّ اللَّبِیْبَ مِنَ الْاِشَارَۃِ یَفْہَمُ — عاقل را اشارہ کافی است
۶۔ اَلْعَبْدُ یُدَبِّرُ وَاللّٰہُ یُقَدِّرُ — ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال
۷۔ اَلْقَلِیْلُ یَدُلُّ عَلَی الْکَثِیْرِ — مشتے نمونہ از خروارے
۸۔ اَلدَّرَاہِمُ بِالدَّرَاہِمِ تُکْسَبُ — کہ زر زر کشد در جہاں گنج گنج
۹۔ اَلْقُلُوْبُ تَشَاہَدُ — دل را بدل رہیست
۱۰۔ اَلْمَرْءُ مَخْفِیٌّ تَحْتَ لِسَانِہٖ — تا مرد سخن نگفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد

لیکن عربی کے بہت سے اقوال ایسے بھی ہیں جو اردو میں زیادہ رائج ہیں۔ مثلاً:

۱۔ اَلْمَاضِیْ لَا یُذْکَرُ — گزشتہ را صلوات
۲۔ تَسْمَعُ بِالْمُعَیْدِیِّ خَیْرٌ مِّنْ اَنْ تَرَاہُ — دور کے ڈھول سہانے
۳۔ رُبَّ صَلِفٍ تَحْتَ الرَّاعِدَۃِ — جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں
۴۔ سَاَلْتُہٗ عَنْ اَبِیْہِ فَقَالَ خَالِیْ شُعَیْبٌ — زمین کی سنا آسمان کی
۵۔ صَفْصَفَۃٌ بِنَقْدٍ خَیْرٌ مِّنْ بَدْرَۃٍ بِوَعْدٍ — نو نقد نہ تیرہ ادھار
۶۔ عُوْدٌ یُعَلِّمُہُ الْفَتْحُ — مار کے آگے بھوت بھاگتا ہے

۷۔ فِی الْمَھْدِ یَنْطِقُ عَنْ نَّجَابَۃِ جَدِّہٖ — ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات

۸۔ کُلُّ کَلْبٍ بِبَابِہٖ نَبَّاحٌ — کتا اپنی گلی میں شیر ہوتا ہے

۹۔ لَا تُضِیْعُوْا الْحِکْمَۃَ عِنْدَ غَیْرِ اَھْلِھَا — اندھے کے آگے روئے اپنی آنکھیں کھوئے

۱۰۔ ھٰذَا کَنَقْشٍ الْحَجَرِ — یہ بات پتھر کی لکیر ہے

یہ ہیں عام عربی اقوال جو اردو میں کسی نہ کسی شکل میں رائج ہیں۔

اب ہم حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ احادیث نقل کرتے ہیں جو اُردو میں محاورات یا ضرب الامثال کی طرح بولی جاتی ہیں:

۱۔ کُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبْدَءْ بِاِسْمِ اللّٰہِ فَھُوَ الْاَبْتَرُ

جو بھی اہم کام اللہ پاک کے نام سے شروع نہ کیا جائے وہ برکت سے محروم ہوتا ہے۔

اس نام پاک کو اسی لیے ہر کام کی ابتداء میں ادا کیا جاتا ہے۔

محسنؔ کاکوروی کہتے ہیں:

کہیں جبریل اشارے سے کہ ہاں بسم اللہ
سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل

داغؔ کا مشہور شعر ہے:

جب کہا میں نے کہ لو مرتا ہوں میں
بولے بسم اللہ، اچھی بات ہے

سالکؔ کہتے ہیں:

جو قصے کا ترے انجام ہے قیس
وہ بسم اللہ ہے یاں داستاں کی

بسم اللہ سے دوسرے محاورات بھی بنائے گئے ہیں۔

۲۔ اَلْحَمْدُ رَأْسُ الشُّکْرِ مَا شَکَرَ اللّٰہَ عَبْدٌ لَا یَحْمَدُہٗ

حمد کرنا شکر کی چوٹی ہے۔ اللہ کا شکر اس بندے نے نہیں کیا جس نے اس کی تعریف نہیں کی۔

الحمدُ للہ کہنے کی دوسری احادیث میں بھی ترغیب آئی ہے۔ اردو میں بہت مستعمل ہے۔

میر کا شعر ہے:

اب حال اپنا اُس کے ہے دل خواہ
کیا پوچھتے ہو الحمد للہ

وزیر لکھنوی کہتے ہیں:

ہوا شاہِ دواوین نام بسم اللہ سے دیواں کا
سرِ دیوان پہ ہے الحمد للہ تاج قرآں کا

ذوق کا شعر ہے:

ہوا حمدِ خدا میں دل جو مصروفِ رقم میرا
الف الحمد کا سا بن گیا گویا قلم میرا

۳۔ حُبُّكَ الشَّيْءَ يُعْمِي وَيُصِمُّ کسی چیز کی محبت تجھے اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے۔

غالب نے اپنے انداز میں کہا ہے:

عشق نے غالب نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

حالی نے ایک موقع پر مسدس میں اس طرح کہا ہے:

نہیں حق سے کچھ اس محبت کو بہرہ
کہ جو تم کو اندھا کرے اور بہرا۔

(ڈپٹی نذیر احمد نے بھی توبۃ النصوح کے پہلے باب میں یہ حدیث لکھی ہے)
حالی نے (قوم کی پاسداری) اسی طرح پھر کہا ہے :

ہیں محبت میں سب اندھے اپنی اپنی قوم کی
یہ وہ خصلت ہے کہ مجبور اس پہ ہے طبعِ بشر

۴۔ جُعِلَتْ قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔
قرۃ العین بہت عزیز چیز کو کہا جانے لگا (اولاد کو بھی)۔

مسرور کا شعر ہے :

آنکھیں جلتی ہیں تپِ فرقت سے
آ مری آنکھ کی ٹھنڈک آ جا

اقبال بھی کہتے ہیں :

وہ صاحبِ تحفۃ العراقین
اربابِ نظر کا قرۃ العین
(ضربِ کلیم)

۵۔ اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ (دعام الدین) نماز دین کا ستون ہے، ستون کا استعارہ اردو میں بھی آتا ہے۔ منیر شکوہ آبادی کا شعر ہے :

سر پہ اٹھا لیا فلکِ بے ثبات کو
قدِ بشر ستون ہے قصرِ حیات کا

حالی نے مسدس میں کہا ہے :

ستونِ چشم بد دور ہیں آپ دیں کے
نمونہ ہیں خلقِ رسولِ امیں کے

۶ - اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ   نماز، مومنوں کی معراج ہے۔

اُردو میں معراج، انتہائی ترقی کے لیے مستعمل ہے۔ منیر شکوہ آبادی کہتے ہیں :

اے منجم ہے وہی شرم و حیا کی معراج
جس فلک پر ہے ہلالِ خمِ گردن اُن کا

اکبر الہ آبادی بھی کہتے ہیں

باقی ہیں قومیں تجارت سے عروج
بس یہی ان کے لیے معراج ہے

۷ - لَاتُجْزِئُ صَلٰوۃٌ لَا یُقْرَأُ فِیْھَا بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ

جس نماز میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ چل نہیں سکتی۔

چلنا (درست ہونا) اردو میں بھی ہے۔ اکبر الہ آبادی کا شعر ہے :

اُمیدِ حور میں مسلم تو ہو گیا ہوں مگر
خدا ہی ہے کہ جو مجھ سے یہ پنجگانہ چلے

۸ - اُقْتُلُوا الْاَسْوَدَیْنِ فِی الصَّلٰوۃِ اَلْحَیَّۃَ وَالْعَقْرَبَ

مار ڈالو کالوں کو نماز میں۔ وہ سانپ اور بچھو ہیں۔

صرف کالا بھی اردو میں سانپ کے لیے مستعمل ہے۔

ذوق کہتے ہیں :

ڈسا ہو کالے نے جس کو کافر تو وہ فسوں کے اثر سے کھیلے
دہان و گیسو کا تیرے مارا، نہ منھ سے بولے نہ سر سے کھیلے

آتش کہتے ہیں :

تریاق کا ہے جوہر اس جسمِ سخت جاں میں
کالا بھی کاٹتا تو مجھ کو اثر نہ ہوتا

داغ کا شعر ہے :

گیسوؤں پر ہاتھ رکھ کر ناز سے کہتے ہیں وہ
سامری کو بھی تو ڈس جائیں یہ دو کالے مرے

۹۔ اذان دینے کے لیے دونوں ہاتھ کانوں تک لے جاتے ہیں۔
کانوں پر ہاتھ رکھنا (پناہ مانگنا) محاورہ یہیں سے بنا ہوگا۔

ذوق کہتے ہیں

الٰہی کان میں کیا اس صنم نے پھونک دیا
کہ ہاتھ رکھتے ہیں کانوں پہ سب اذاں کے لیے

داغ بھی کہتے ہیں

وہ عرضِ وصل سے رکھتے ہیں ہاتھ کانوں پر
اثر یہ خوب تری طرزِ گفتگو نے کیا

یہ قرآنی محاورہ (و یجعلون اصابعھم فی اذانھم) سے

قریب ہے۔

۱۰۔ رفع یدین (جس میں ائمہ کا اختلاف ہے) اُردو میں "کسی چیز سے ہاتھ اٹھالینا" (ترک کر دینا) کا ماخذ ہے۔

ظفر نے کئی جگہ استعمال کیا ہے:

۱۔ ہاتھ اٹھایا سینہ کاوی سے نہ میں نے عشق میں
اے جنوں جب تک نہ میرا ٹوٹ ہر ناخن گیا

۲۔ اٹھاؤ ہاتھ بس اب شیوۂ جفا سے ڈرو
کہ ظلم خوب نہیں اے بُتو خدا سے ڈرو

شبلی کہتے ہیں:

تقلیدِ کہن سے ہاتھ اٹھائیں
تہذیب کے دائرے میں آئیں

۱۱۔ سبّابہ۔ سب بمعنی گالی۔ اسلام سے پہلے عرب لوگ گالی دیتے وقت انگلی اٹھاتے تھے (اسلام میں اشارۂ توحید کے لیے سبّابہ کو سبّاحہ کہا گیا)

اسی سے انگلی اٹھانا، مطلق اشارہ کرنے کے لیے بھی مستعمل ہے۔

داغ کہتے ہیں:

باغ میں گُل کِھلے جاتے ہیں کہ وہ آتے ہیں
انگلیاں سرو اٹھاتے ہیں کہ وہ آتے ہیں

نذیر کا شعر ہے :

مشورت کچھ قاتلوں میں ہے ہمارے قتل کی
بے طرح اٹھنے لگی ہیں جانب سر انگلیاں

اور رسوائی کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ نذیر احمد لکھتے ہیں :
"ابن الوقت گھر لوٹ کر آیا تو ہر طرف سے انگلیاں اٹھتی تھیں"۔
(ابن الوقت صفحہ ۹۵)

۱۲۔ نماز ختم کرنے کے لیے سلام پھیرتے ہیں۔
تعلق ختم کرنے کے لیے بھی اردو میں یہ محاورہ آتا ہے۔

داغ کا شعر ہے :

اے عشق رخصت اے ہوس و آرزو سلام
اپنا مقام آج سے دارِ بقا ہوا

نذیر احمد لکھتے ہیں :

"سلام ہے ایسے دین کو کہ انسان اپنے آپ سے باہر ہو جائے اور دنیا کے نیک و بد پر کچھ نظر نہ کرے"۔
(توبۃ النصوح ص ۱۱۶)

لفظ سلام سے اردو میں اور محاورے بھی بنتے ہیں۔

۱۳۔ اَلدُّعَاءُ یَرُدُّ الْبَلَاءَ دعا، بلا کو ٹالتی ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی رح لکھتے ہیں :

"دعاء، نازل شدہ بلا کو بھی نافع ہے اور اس بلا کو بھی جو ابھی نازل نہیں ہوئی ..." (دیباچہ مناجاتِ مقبول)

"دعا، ردِّ بلا" اردو میں عام طور پر بولا جاتا ہے۔ اسی مضمون کو مومن نے اس طرح استعمال کیا ہے :

ایک دشمن کہ چرخ ہے، نہ رہے
تجھ سے یہ اے دعا نہیں ہوتا

۱۴۔ قُلِ الْحَقَّ وَاِنْ کَانَ مُرًّا ۔ سچ کہو اگرچہ وہ تلخ ہو۔

اَلْحَقُّ مُرٌّ بھی آتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی :
اَلصِّدْقُ یُنْجِیْ وَالْکِذْبُ یُھْلِکُ ۔ سچ نجات دلاتا ہے اور جھوٹ تباہ کرتا ہے۔
مولانا حالی نے کلمۃ الحق نظم لکھی ہے جس کے چند اشعار یہ ہیں :

شے کوئی تجھ سے کڑوی نہ ہوگی
حنظل میں ایسی تلخی نہ ہوگی

ہے ناگواری پہچان تیری
اَلْحَقُّ مُرٌّ ہے شان تیری

ہوتی ہے سچ سے جب سب کو نفرت
تو جھوٹ پر واں کرتی ہے لعنت

اسماعیل میرٹھی کہتے ہیں :

(سچ اور جھوٹ)
سچ کہو گے تو دل رہے گا صاف
سچ سے ہو جائیں گے قصور معاف

ہے بُرا جھوٹ بولنے والا
آپ کرتا ہے اپنا منہ کالا

۱۵۔ مَثَلُ اَصْحَابِیْ فِیْ اُمَّتِیْ کَالْمِلْحِ فِی الطَّعَامِ ۔ میرے اصحاب کی مثال میری امت میں ایسی ہے جیسے کھانے میں نمک ۔ (بغیر نمک کے کھانے میں لذّت نہیں ہوتی)

سالک کا شعر ہے :۔

ہزار حصّہ بڑھی لذّتِ ستم اُن کی
رہا گِلہ بھی تو کالملح فی الطعام رہا

۱۶۔ لَمْ یُحْرَمْ مَنْ فُصِدَ لَہٗ

جس کا کچھ تھوڑا سا بھی مطلب پورا ہو گیا تو وہ محروم نہیں۔
اسی طرح کی ایک اور حدیث ہے :۔
اَلْمَاشُ خَیْرٌ مِّنْ لَاشٍ   گھر کا کچھ بھی سامان ہو، گو کم قیمت سہی، کچھ نہ ہونے سے بہتر ہے۔
اردو میں کئی طرح سے بولتے ہیں۔ مثلاً
ہونا، نہ ہونے سے بہتر ہے۔ زیادہ نہیں تو تھوڑا سہی۔
کچھ نہیں تو اتنا سہی۔ جیسے غالبؔ کا شعر ہے :۔

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

فارسی میں کہتے ہیں :

از خرس موئے بس است

انگریزی میں بھی بولتے ہیں :۔

"SOMETHING IS BETTER THAN NOTHING"

"بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی" ایک اردو کہاوت بھی ہے۔

۱۷۔ لَیْسَ الْغِنٰی عَنْ کَثْرَۃِ الْعَرَضِ اِنَّمَا الْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ

تونگری، مال کی زیادتی کا نام نہیں بلکہ تونگری دل کی تونگری ہے۔

حضرت سعدیؒ کا مشہور مقولہ ہے۔

"تونگری بہ دل است نہ بہ مال و بزرگی بہ عقل است نہ بہ سال"

۱۸۔ ایک اور حدیث ہے:

خَیْرُ الْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ۔ بہترین غنا نفس کا غنا ہے۔

درد کہتے ہیں:

ہمت رفیق ہووے تو فقر سلطنت ہے
آتا ہے ہاتھ یعنی یاں تخت دل کے ہاتھوں

رشک کا شعر ہے

لازم ہے یہ سوال کو سمجھو سوالِ قبر
سامان میں فقیر رہو دل غنی رہے

یوں بھی ایک حدیث آتی ہے:

۱۹۔ آفَۃُ الدِّیْنِ الْھَوٰی۔ دین کی آفت ہوا و ہوس ہے۔

حضرت سعدیؒ کہتے ہیں:

؎ آنانکہ غنی تراند محتاج تر اند

ذوق کا شعر ہے:

حرص کے پھیلتے ہیں پانو بقدرِ وسعت
تنگ ہی رہتے ہیں دنیا میں فراغت والے

۲۰۔ إِذَا أَرَادَ اللّٰهُ تَعَالَىٰ إِنْفَاذَ قَضَائِهٖ وَ قَدَرِهٖ سَلَبَ ذَوِي الْعُقُوْلِ عُقُوْلَهُمْ حَتّٰى يَنْفُذَ فِيْهِمْ قَضَاءُهٗ وَقَدَرُهٗ ۔۔۔۔۔۔۔ جب اللہ تعالیٰ اپنی قضا و قدر کو نافذ کرنا چاہتا ہے تو عقلمندوں کی عقل کو سلب کر لیتا ہے حتیٰ کہ ان میں اس کی قضا و قدر نفوذ کر جاتی ہے۔

حضرت سعدیؒ کہتے ہیں۔ ع

چوں قضا آید طبیب ابلہ شود

امیر خسروؒ کا شعر ہے:

از سرِ بالینِ من برخیز اے ناداں طبیب
دردمندِ عشق را دارو بجز دیدار نیست

میرؔ نے اس شعر کا ترجمہ یوں کیا ہے:

بس طبیب اٹھ جا میری بالیں سے مت دے دردِ سر
کام یاں آخر ہوا، اب فائدہ تدبیر کا

۲۱۔ مَنْ أَبْطَأَ بِهٖ عَمَلُهٗ لَمْ يُسْرِعْ بِهٖ نَسَبُهٗ
جس کا عمل کسی کو پیچھے رکھے تو اس کا نسب آگے نہیں بڑھائے گا۔

اقبالؔ کہتے ہیں:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

۲۲۔ مِلَاكُ الْعَمَلِ خَوَاتِمُهٗ ۔ عمل کا حساب اس کے نتائج پر ہے۔

۲۳۔ اس طرح بھی ہے۔
اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالْخَوَاتِیْمِ۔ وہی عمل معتبر ہے جس کا خاتمہ بخیر ہو۔
جیسی کرنی ویسی بھرنی، کیے کا پھل پانا وغیرہ محاورات ہیں۔
نوح ناروی کہتے ہیں:

خرّمی مفقود، عشرت گم، مسرّت دور ہے
جیسی کرنی ویسی بھرنی' یہ مثل مشہور ہے

۲۴۔ ایک اور حدیث ہے:
یُبْعَثُ عَلٰی نِیَّاتِهِمْ۔ ہر شخص کا حشر اپنی نیت کے مطابق ہوگا۔
یہ حدیث بھی مذکورہ بالا احادیث سے مطابقت رکھتی ہے۔
۲۵۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ۔ جیسی نیت ہوگی ویسا عمل ہوگا۔

بیان میرٹھی کا شعر ہے:

تھی نزاعِ مصلحت آمیز پر رنجش فضول
انما الاعمال بالنیات ہے قولِ رسولؐ

۲۶۔ اِذَا لَمْ تَسْتَحْیِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ۔
جب تجھے حیا نہیں آتی تو جو تیرے جی میں آئے کر۔
اردو میں بولتے ہیں کہ "اتر گئی لوئی پھر کیا کرے گا کوئی۔
یوں بھی بولتے ہیں کہ "منہ کی گئی جو لوئی تو کیا کرے گا کوئی۔
میر کا شعر ہے:

آتی ہے شمع شب کو آگے ترے یہ کہہ کر
منہ کی گئی جو لوئی تو کیا کرے گا کوئی

۲۷۔ اِنَّ الدِّیْنَ النَّصِیْحَةُ لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِکِتَابِهٖ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِهِمْ ـــــ بے شک

دین، نصیحت ہے اللہ کے لیے اور اس کے رسولؐ کے لیے اور اس کی کتاب کے لیے اور مسلمانوں کے حاکموں کے لیے (جب تک وہ شریعت پر چلتے ہوں) اور عام مسلمانوں کے لیے (ان کے دین اور دنیا کی اصلاح کی فکر کرنا)

حالی نے اپنی نظم "فلسفۂ ترقی" میں کہا ہے:

دین کہتے ہیں جسے وہ خیر خواہی کا ہے نام
ہے مسلمانو یہ ارشادِ رسولؐ انس و جاں

۲۸- اَلشَّبَابُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْجُنُوْنِ - جوانی جنون کا ایک شعبہ ہے۔ جوانی دیوانی مشہور ہے۔ حضرت سعدیؒ نے بھی فرمایا ہے کہ:

"در ایام جوانی چنانکہ افتد دانی"

قدر کا شعر ہے:

سچ یہ کہتے ہیں کہ دیوانی جوانی ہوتی ہے
آپ نے دل لے کے مجھ سے جانِ من کیا کر دیا

ریاض خیر آبادیؒ کہتے ہیں:

ایسی دیوانی جوانی کہ یہ کہتی آئی
لے مبارک ہو تجھے چاک گریباں ہونا

۲۹- اَلسَّفَرُ قِطْعَةٌ مِّنَ الْعَذَابِ - سفر سقر ہے۔ فسانۂ عجائب میں ہے کہ "سفر اور سقر کی صورت ایک ہے اس سے بچنا نیک ہے"۔ (لوتے کا بیان)

۳۰- کُلُّ وَدُوْدٍ اِذَا غَضِبَتْ اَوْ اُوْذِیَ اِلَیْهَا قَالَتْ هٰذِهٖ یَدِیْ فِیْ یَدِكَ لَا اَكْتَحِلُ بِغُمْضٍ حَتّٰی تَرْضٰی۔

(جنتی عورتوں کے متعلق فرمایا کہ) ہر ایسی محبت کرنے والی بیوی

جب تمہیں غصہ آئے یا اسے رنج پہنچایا جائے تو وہ کہہ دے کہ یہ میرا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ میں اس وقت تک نہیں سوؤں گی جب تک آپ راضی نہ ہوں۔

ہاتھ میں ہاتھ دینا، محاورہ ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد لکھتے ہیں کہ "بے جانے بوجھے، زندگی بھر کے لیے کسی کے ہاتھ میں ہاتھ دیدینا تو اندھیرے کا نشانہ ہے (ایامی)

شوق کا شعر ہے:

میں کہاں ہوں جو ساتھ دوں تیرا
ہاتھ میں اپنے ہاتھ دوں تیرا

۳۱۔ رُفِعَ الْقَلَمُ عَنِ النَّائِمِ وَ الصَّبِیِّ وَ الْمَعْتُوْہِ

سونے والے اور بچے اور مجنوں سے قلم اٹھالیا گیا۔ (یعنی وہ مکلف نہیں ہیں)

درد کہتے ہیں:-

مشابہ کوئی ان آنکھوں سے کم ہے
یہ نرگس ہے سو مرفوع القلم ہے

رشک کا شعر ہے:-

ہوں وہ سودائی کہ لکھواؤں گا جس سے خطِ شوق
منتشر کیسا کہ مرفوع القلم ہو جائے گا

۳۲۔ جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا هُوَ كَائِنٌ۔ قلم خشک ہو چکا ہے اس کے

متعلق جو ہونے والا ہے۔

مومن کا شعر ہے:

غلط کہ صانع کو ہو گوارا خراشِ انگشتہائے نازک
جوابِ خط کی امید رکھتے جو قولِ جفّ القلم نہ ہوتا

۳۳۔ اَھْلُ الْجَنَّۃِ بُلْہٌ ــــ اہلِ جنت بھولے ہوتے ہیں
(بھولے لوگ جنتی کہلائے جاتے ہیں)

رومی کہتے ہیں:

اکثر اہل الجنۃ البلہ اے پسر
بہر ایں گفتہ ست سلطان البشر[۱۷]

ذوق کا شعر ہے:

آخرش دیکھا تو العلم حجاب الاکبر
عاقبت پایا تو ہاں بُلہ کو اہلِ جنّت

۳۴۔ تَجِدُوْنَ شَرَّ النَّاسِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ ذَا الْوَجْھَیْنِ الَّذِیْ یَأْتِیْ ھٰٓؤُلَآءِ بِوَجْہٍ وَّھٰٓؤُلَآءِ بِوَجْہٍ۔
تم قیامت کے دن بدترین آدمی دو رُخے کو پاؤ گے جو اُن کے پاس ایک منہ سے آتا ہے اور دوسرے کے پاس دوسرے منہ سے۔
اردو میں بھی دُو رُو، دو رُخا وغیرہ محاورے میں آتے ہیں۔

شعور کا شعر ہے :

ظلمتِ کفر ہو زائل شرفِ ایماں سے
نورِ وحدت سے دو روجہاں یک تو ہوجا

۳۵۔ مَنْ طَلَبَ الدُّنْیَا حَلَالاً اسْتِعْفَافاً عَنِ الْمَسْئَلَةِ وَسَعْیاً عَلٰی اَهْلِهٖ وَ تَعَطُّفاً عَلٰی جَارِهٖ لَقِیَ اللّٰهَ تَعَالٰی یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَوَجْهُهٗ مِثْلُ الْقَمَرِ لَیْلَةَ الْبَدْرِ ۔

جو شخص جائز ذریعے سے دنیا اس لیے کمائے کہ بھیک مانگنے سے بچے اور بال بچوں کے لیے کوشش کرے اور اپنے ہمسایوں پر مہربانی کرے ، ایسا شخص قیامت کے دن خدا سے ملے گا اور اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح رُوشن ہوگا ۔

حالی نے اس حدیث کو اس طرح پیش کیا ہے :

غریبوں کو محنت کی رغبت دلائی   کہ بازو سے اپنے کرو تم کمائی
خبر تاکہ اس سے ہو اپنی پرائی   نہ کرنی پڑے تم کو در در گدائی

طلب سے ہے دنیا کی گریاں یہ نیت
تو چمکو گے واں ماہِ کامل کی صورت

۳۶۔ اِغْتَنِمْ خَمْساً قَبْلَ خَمْسٍ ۔ شَبَابَكَ قَبْلَ هَرَمِكَ ۔ صِحَّتَكَ قَبْلَ سُقْمِكَ ۔ وَغِنَائَكَ قَبْلَ فَقْرِكَ وَفَرَاغَكَ قَبْلَ شُغْلِكَ وَحَيَاتَكَ قَبْلَ مَوْتِكَ ۔

پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جان ؛ بڑھاپے سے پہلے جوانی ، بیماری سے پہلے صحت ، محتاجی سے پہلے مالداری

مشاغل سے پہلے فراغت اور موت سے پہلے زندگی۔

حالی نے مسدس میں لکھا ہے:

غنیمت ہو صحت علالت سے پہلے
فراغت مشاغل کی کثرت سے پہلے
جوانی بڑھاپے کی زحمت سے پہلے
اقامت، مسافر کی رحلت سے پہلے
فقیری سے پہلے غنیمت ہے دولت
جو کرنا ہے کر لو کہ تھوڑی ہے مہلت

۳۷۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَرْفَعُ شَیْئًا مِّنَ الدُّنْیَا اِلَّا وَضَعَہٗ ــــــ

بے شک اللہ پاک اس دنیا کی کسی چیز کو بلند نہیں کرتا مگر اُس کو پست کر دیتا ہے۔

ہر کمالے را زوالے

ظفر کہتے ہیں:

ہوتا ہے چودھویں کو ہمیشہ خسوفِ ماہ
جو دن کمال کا ہے وہی دن زوال کا

دوسرے شعراء نے اپنے انداز میں لکھا ہے۔ ناسخ کہتے ہیں:

دو روز ایک وضع پہ رنگِ جہاں نہیں
وہ کون سا چمن ہے کہ جس کو خزاں نہیں

شاہ نصیر کا شعر ہے:

نصیر یادِ جوانی عبث ہے پیری میں
کہ ایک رنگ پہ رہتا نہیں جہاں کا رنگ

۳۸۔ کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّکَ غَرِیْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ ــــــ

دنیا میں ایسا رہ جیسے تو ایک مسافر ہے یا راستہ گزرنے والا۔

انشا کا مشہور شعر ہے:

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

اسی مضمون کو رند نے یوں پیش کیا ہے:

ہمراہی کمر باندھ کے راہی ہوئے یاں سے
آگاہ کرو جلد مرے ہمسفروں کو

ایک اور حدیث ہے:

۳۹۔ کُونُوْا لِلدُّنْیَا اَضْیَافًا ــــ دنیا میں مہمان کی طرح رہو

اسیر لکھنوی کا شعر ہے:

ہوں رہروِ عدم مجھے دنیا سے کام کیا
دو روز دیکھنے کو یہ میلا، ٹھہر گیا

انیس کہتے ہیں:

دنیا عجب سرائے فانی دیکھی — ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا — جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

خلیل لکھنوی کا شعر ہے:

مسافر رہِ نا آشنائے منزل ہیں
مثالِ ریگِ رواں جائیں گے کہاں، دیکھیں

قلق کہتے ہیں

مہمانِ جہاں تھے ایک شب کے
شام آئے اور سحر گئے ہم

امیر مینائی بھی کہتے ہیں

کوئی آتا ہے عدم سے تو کوئی جاتا ہے
سخت دونوں میں خدا جانے سفر کس کا ہے

۴۰۔ مَنِ انْقَطَعَ اِلَى الدُّنْيَا وَكَّلَهُ اللّٰهُ اِلَيْهَا ۔

جو شخص دنیا کی طرف ہمہ تن مائل ہوگا اللہ پاک اُس کو اسی کا کر دے گا۔

ولی کہتے ہیں :

نہ پاوے دین کی لذت جسے دنیا کی ہے خواہش
قفل ہے لذتِ دنیا حقیقت کے خزانے کا

ذوق کا شعر ہے

منہ سے بس کرتے نہ ہرگز یہ خدا کے بندے
گر حریصوں کو خدا ساری خدائی دیتا

ایک حدیث یہ بھی ہے :

۴۱۔ حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ ۔

دنیا کی محبت تمام خطاؤں کی جڑ ہے

ذوق کہتے ہیں :

سب کو دنیا کی ہوس خوار لیے پھرتی ہے
کون پھرتا ہے یہ مُردار لیے پھرتی ہے

ایک اور حدیث ہے :

۴۲۔ اَلدُّنْیَا جِیْفَۃٌ وَّطَالِبُھَا کِلَابٌ۔
دنیا مردار ہے اور اس کا طالب کُتّا ہے

رند کہتے ہیں :

غذا ہے سگِ دنیا کی جیفۂ دنیا
مجھے تو تیسرے فاقے بھی یہ حلال نہیں

۴۳۔ اَلدُّنْیَا مَزْرَعَۃُ الْاٰخِرَۃِ ۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔

میر حسن نے اپنی مثنوی سحر البیان میں کہا ہے۔

یہ دنیا جو ہے مزرعِ آخرت
فقیری میں ضائع کرو اس کو مت

۴۴۔ مَصِیْرُکُمْ اِلٰی اَرْبَعَۃِ اَذْرُعٍ ـــــــ تم کو آخرکار چار ہاتھ جگہ (قبر) میں جانا ضرور ہے۔

شعور کہتے ہیں :

ہو نہ محتاجِ کفن مقدوریاں اتنا تو ہو
لیجیے دو گز زمیں اے آسماں اتنا تو ہو

بہادر شاہ ظفر کا شعر ہے:

کتنا ہے بدنصیب ظفرؔ، دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

ناسخ بھی کہتے ہیں:

کل ہے اک دو گز زمیں رہنے کو بعد از قبضِ روح
آج گو قبضے میں سارا ربعِ مسکوں ہو گیا

۴۵۔ اَلْمَرْءُ عَلٰی دِیْنِ خَلِیْلِہٖ ۔ آدمی اپنے دوست کے طریقہ پر ہوتا ہے

یعنی: کند ہم جنس باہم جنس پرواز
کبوتر با کبوتر، باز با باز

رشک کا شعر ہے:

باغِ سخنوری میں ہوں وہ مُرغِ خوش بیاں
عنقا ہوئی ہے جنس مرے ہم صفیر کی

ایک دوہا مشہور ہے:

اُتم سے اُتم ملے اور ملے نیچ سے نیچ
پانی سے پانی ملے اور ملے کیچ سے کیچ

شبلی نے قریش کے ایک واقعہ کو اس طرح نظم کیا ہے

جنگِ ناجنس سے معذور ہیں ہم آلِ قریش
بھیج اُن کو جو ہیں رتبے میں ہمارے ہم سر

۴۶۔ لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلٰثَۃِ مَسَاجِدَ ۔۔۔ کجاوے نہ باندھے جاتیں (سفر نہ کیا جائے) مگر تین مسجدوں کی طرف۔

[illegible] نواب)۔
انہیں کہتے ہیں :

ہودج بھی کَسے جاتے ہیں محمل بھی ہیں تیار
چلاتے ہیں درباں کوئی آئے نہ خبردار

مولانا احسن مارہروی کا شعر ہے
جتنی ہوتی ہے طویل العمر ہوتی ہے قوی
ہے عروجِ ارتقا اس کے لیے شدِّ رحال
(رماد رگیتی)

۴۷۔ خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُھَا — بہتر کام وہ ہیں جو متوسط ہوں۔ (نہ ان میں افراط ہو نہ تفریط)۔

سحر لکھنوی کا شعر ہے :
خیر الامور اوسطہا پر عمل کیا
رکھا قدم جو راہِ توسط کے درمیاں

منیر شکوہ آبادی کہتے ہیں
شاگردِ حضرت علی اوسط ہو اے منیؔر
خیر الامور اوسطہا پر نظر رہے

۴۸۔ لَیْسَ الْخَبَرُ کَالْمُعَایَنَۃِ — سُنی ہوئی بات آنکھوں دیکھی جیسی نہیں ہوتی۔

میر تقی میر کہتے ہیں:

تجھ سے یوسف کو کیوں کہ دیں نسبت
کب شنیدہ ہو دیدہ کی مانند

ع شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ

رند بھی کہتے ہیں:

ستم کرتا ہے چرخ سفلہ پرور، اہلِ غیرت پر
جو کانوں سے نہ سنتے تھے وہ آنکھوں سے دکھاتا ہے

۴۹ - اَلْیَدُ الْعُلْیَا خَیْرٌ مِّنَ الْیَدِ السُّفْلیٰ ـــ اوپر کا ہاتھ (دینے والا) نیچے کے ہاتھ (لینے والے) سے بہتر ہے۔ ہاتھ اونچا ہونا، ہاتھ اونچا کرنا، سخاوت کے لیے مستعمل ہے۔

منیر کا شعر ہے:

عیدِ اضحیٰ مرے نواب کی سرکار میں ہے
دستِ زر بخش اٹھا ہے گہر افشانی کو

ایک اور حدیث ہے:

۵۰ - اَسْرَعُکُنَّ لَحَاقًا بِیْ اَطْوَلُکُنَّ یَدًا ـــ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج سے فرمایا کہ تم میں سے میرے ساتھ جلد تر ملنے والی وہ بی بی ہے جس کا ہاتھ زیادہ لمبا (سخی) ہے۔ حضرت زینبؓ بنت جحش کا ہاتھ سخاوت میں سب سے بڑھا ہوا تھا۔ اس لیے وہ سب سے پہلے فوت

ہوئیں حالانکہ ہاتھ کی لمبائی حضرت سودہؓ کی سب سے زیادہ تھی) ہاتھ کھلا ہونا بھی محاورہ ہے۔

ید طولیٰ ہونا یعنی کمال اور مہارت حاصل ہونا کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ سخاوت کے معنی میں ہندی میں بھی آتا ہے۔

"تلسی داس غریب کی کوئی نہ پوچھے بات
مایہ کو مایہ ملے لمبے کر کر ہات"

۵۱ اَلْمُؤَذِّنُوْنَ اَطْوَلُ النَّاسِ اَعْنَاقاً یَوْمَ الْقِیَامَۃِ ــــ اذان دینے والے لمبے ہوں گے لوگوں سے گردن میں قیامت کے دن۔

اونچی گردن، بلند گردن (ممتاز اور معزز) ہونا اردو میں بھی مستعمل ہے اور فارسی میں بھی۔ جیسے حضرت سعدیؒ کہتے ہیں، ؎ گردنِ بے طمع بلند شود

علامہ اقبالؒ نے ساقی نامہ (بالِ جبریل) میں کہا ہے:

وہی ناں ہے اس کے لیے ارجمند
رہے جس سے دنیا میں گردن بلند

۵۲۔ اَلْجَنَّۃُ تَحْتَ اَقْدَامِ الْاُمَّھَاتِ۔

جنّت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔

دبیرؔ کا مشہور مصرع ہے:

زیرِ قدمِ والدہ فردوسِ بریں ہے

اور یہ مصرع انیسؔ سے منسوب ہے۔

ع کہتے ہیں ماں کے پانو کے نیچے بہشت ہے

مولانا احسن مارہروی کا شعر ہے:

سچ ہے یہ ارشاد، زیرِ پائے مادر ہے بہشت
منحرف جو ماں سے ہو اچھی نہیں اس کی سرشت

۵۳ - مَنْ اَصَابَ مَالاً مِّنْ نَهَاوِشٍ اَذْهَبَهُ اللّٰهُ فِیْ نَهَابِرِ
جس نے ظلم کا مال پایا تو اللہ پاک اس کو بربادیوں میں تلف کر دیگا۔
مالِ حرام بود بجای حرام رفت

آتش کہتے ہیں:

مضموں کا چور ہوتا ہے رسوا جہان میں
چکھتی خراب کرتی ہے مالِ حرام کی

۵۴ - مَالَا عَيْنٌ رَاَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ ــــــ کسی آنکھ
نے نہیں دیکھا اور کسی کان نے نہیں سُنا۔

محسن کاکوروی کہتے ہیں:

آنکھوں سے لکھوں صفت وہ آنکھیں
مالا عَيْنٌ رَاَتْ وہ آنکھیں

دوسرے شعراء نے بھی محبوب کے "سراپا" کے لیے یہ مضمون لیا ہے۔

صفحۂ خدِ مبارک پہ الف بنی ہے دیکھنا عارضِ انور کا خدا بنی ہے

اس شعر کا مضمون اس حدیث سے ماخوذ ہے۔

مَنْ رَاٰنِیْ فَقَدْ رَاَی الْحَقَّ ـــــ
جس نے مجھے دیکھا البتہ اس نے حق کو دیکھا

سودا کا شعر ہے:

حدیث من رانی دال ہے اس گفتگو پر
کہ دیکھا جس نے اس کو اس نے دیکھی شکلِ یزدانی

مولانا احمد رضا خاں کہتے ہیں

کھلے کیا راز محبوب و محب مستانِ غفلت پر
شرابِ قد رای الحق زیبِ جامِ من رانی ہے

۵۵- مَنْ كَفَّ لِسَانَهٗ عَنْ اَعْرَاضِ النَّاسِ اَقَالَ اللّٰهُ عَثْرَتَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ـــــ جو شخص اپنی زبان کو لوگوں کی آبرو ریزی سے روکے گا تو خدا بھی قیامت کے دن اس کی لغزشوں کو معاف کر دے گا۔

ایک اور حدیث ہے۔

۵۶- اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ يَّدِهٖ وَلِسَانِهٖ ـــ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ سے اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں۔

ایک حدیث یہ بھی ہے،

۵۷ لَا تَخْرِقَنَّ عَلٰى اَحَدٍ سِتْرًا ـــ تم کسی کی پردہ دری نہ کرو۔

پردہ دری اور پردہ داری کے بہت سے محاورات استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً:

مومن کا شعر ہے:

تیرے پردے نے کی یہ پردہ دری
تیرے چھپتے ہی کچھ چھپا نہ رہا

درد کہتے ہیں:

دل تنگ ہے یہ غنچۂ دل، منھ نہ کھلاتا
جوں نکہتِ گل اس میں تری پردہ دری ہے

غالب کہتے ہیں:

بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

اصغر گونڈوی کا شعر ہے:

کہہ کے کچھ لالہ و گل رکھ لیا پردہ میں نے
مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا رسوا ہونا

۵۸۔ اَلْکَیِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَہٗ۔ عقلمند وہ ہے جس نے اپنے نفس کو مطیع بنایا۔

ع ہوا جب نفس تابع مطلبِ دل ہو گیا حاصل (امیر)

ایک اور حدیث ہے:

۵۹۔ اِنَّمَا الشَّدِیْدُ الَّذِیْ یَمْلِکُ نَفْسَہٗ عِنْدَ الْغَضَبِ۔
بہادر وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔

ذوق کہتے ہیں:

جو مارے نفس کو اور کرلے اپنے غصّے کو زیر
بنائے سانپ کا کوڑا وہ شیر پر چڑھ کر

ذوق کا ایک اور شعر (نفسِ امّارہ کے متعلق) ہے :

بڑے موذی کو مارا نفسِ امّارہ کو گر مارا
نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا

تسلیم بھی کہتے ہیں :

مار ڈالا ہم کو اس کم بخت نے
نفسِ امّارہ مگر مرتا نہیں

نفس کو مارنا اور غصّہ پی جانا اردو میں عام ہے۔

داغ کہتے ہیں :

اس نے غیروں کو بلائی بزم میں
رشک سے ہم غصّہ پی کر رہ گئے

۶۰ - يَعْرِفُ الْفَضْلَ لِأَهْلِ الْفَضْلِ ذُو الْفَضْلِ
اہلِ فضل کے درجے کو اہلِ فضل ہی جانتے ہیں

ع قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

ذوق کا شعر ہے :

گہر کو جوہری صرّاف زر کو دیکھتے ہیں
بشر کے دیکھنے والے بشر کو دیکھتے ہیں

۶۱ - مَنْ كَثُرَ كَلَامُهُ كَثُرَ سَقَطُهُ ـــــ جس کی باتیں زیادہ ہوں گی اس کی غلطیاں زیادہ ہوں گی۔

ایک اور حدیث ہے :

مَنْ صَمَتَ نَجَا ـــــ جو چپ رہا اس نے نجات پائی

ولی کہتے ہیں :

ہمیشہ لشکرِ آفات سوں رہے محفوظ
نصیب جس کو ہوا ہے حصارِ خاموشی

مقولہ ہے ایک چپ لاکھ بلا کو ٹالتی ہے ۔ (مولانا حالی کی ایک نظم "چپ کی داد" عورتوں کی بے زبانی کے سلسلے میں ہے ۔)
عربی کا ایک قول یہ بھی ہے :
اَلْمَرْءُ مَخْفِیٌّ تَحْتَ لِسَانِہٖ ۔
اور حضرت سعدیؒ کا مشہور شعر ہے :

تا مردِ سخن نگفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد

۶۲ ۔ مَنْ یُدِمْ قَرْعَ الْبَابِ یُوْشِكْ اَنْ یُفْتَحَ لَہٗ ـــ جو دروازہ کھٹکھٹاتا رہتا ہے گا ضرور اس کے لیے دروازہ کھولا جائے گا ۔
مسدس حالی میں ہے :

وہ بھولے ہوئے ہیں یہ عادت خدا کی
کہ حرکت میں ہوتی ہے برکت خدا کی

اقبال کا فلسفۂ "عشق" بھی یہی ہے ۔ ایک ہی شعر ملاحظہ ہو :

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود (ساقی نامہ)

اصغر گونڈوی اپنے انداز میں کہتے ہیں ۔

وہ موت ہے کہ کہتے ہیں جس کو سکون سب
وہ عین زندگی ہے جو ہے اضطراب میں

شیفتہ بھی کہتے ہیں :

جو جان کھو کے پائیے وہ فوزِ عظیم ہے — وہ چیز ڈھونڈتے ہیں تن آسانیاں دل میں ہم

۶۳۔ كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَكُوْنَ كُفْراً۔ بہت ممکن ہے کہ محتاجی کفر ہو جائے۔

ولی کہتے ہیں:

مفلسی سب بہار کھوتی ہے — مرد کا اعتبار کھوتی ہے

سرسید نے ایک جگہ لوگوں کا حال اس طرح لکھا ہے کہ "پیٹ ایسی چیز ہے کہ دین رہے یا جاوے، خدا ملے یا نہ ملے اس کو بھرنا چاہیئے"۔ (تہذیب الاخلاق صفحہ ۱۵۲۔ لاہور ۱۳۱۳ھ)

نظیر اکبر آبادی کی نظم "مفلسی" کے ایک بند کا شعر ہے:

جو اہلِ فضل عالم و فاضل کہاتے ہیں
مفلس ہوئے تو کلمہ تلک بھول جاتے ہیں

ایک اور حدیث ہے:

اَلْبَطَالَةُ تُقَسِّي الْقَلْبَ۔ بے کاری دل کو سخت بنا دیتی ہے یعنی بے حس اور مردہ۔

ع پراگندہ روزی پراگندہ دل

۶۴۔ اِنَّ لِرَبِّكُمْ فِيْ اَيَّامِ دَهْرِكُمْ نَفَحَاتٍ اَلَا فَتَعَرَّضُوْا لَهَا۔ بیشک تمھارے زمانے کے ایام میں تمھارے رب کی خوشبوئیں پھیلی ہوتی ہیں، سو ان کو لیتے رہو۔

حالی نے اسی حدیث سے حمد کی ایک غزل میں یہ شعر تیار کیا ہے۔

آفاق میں پھیلے گی کب تک نہ مہک تیری
گھر گھر لیے پھرتی ہے پیغام صبا تیرا

۶۵۔ مَا امْتَلَأَتْ دَارٌ حَبْرَةً اِلَّا امْتَلَأَتْ عَبْرَةً
کوئی گھر خوشی سے نہیں بھرتا لیکن بالآخر وہ آنسوؤں سے بھرے گا (خوشی کے بعد غم)

درد کہتے ہیں :

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا
کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا

جعفر علی حسرت کہتے ہیں ۔

اپنے لب تو وا نہ کر اے خندۂ زخمِ جگر
چرخ دے گا لاکھ غم اس شادمانی کے سبب

حالی کہتے ہیں :

عشرت کا ثمر تلخ سدا ہوتا ہے
ہر قہقہہ پیغامِ بُکا ہوتا ہے

ظفر کا شعر ہے :

ہے صرصرِ حوادثِ دوراں کا غم بھی ساتھ
کیونکہ ہنسے کہیں دلِ مسرور کا چراغ

شادی اور غمی کے ساتھ شادی مرگ بھی محاورہ آتا ہے ۔ مثلاً :
امیر مینائی کا شعر ہے :

میرے مرتے ہی زمانہ درہم و برہم ہوا
یہ خوشی پھیلی کہ شادی مرگ اک عالم ہوا

ایک اور حدیث ہے :
کَثْرَۃُ الضِّحْکِ تُمِیْتُ الْقَلْبَ ـــــــ زیادہ ہنسی مُردہ دل بنا دیتی ہے ۔ لیکن زندہ دلی پسندیدہ ہے ۔ جیسا کہ ناسخ نے کہا ہے :

زندگی ، زندہ دلی کا ہے نام
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

٦٦- هَاجِرُوا تُوَرِّثُوا اَبْنَاءَكُمْ مَجْدًا ـــ تم ہجرت کرو، اپنے بچوں کو ورثے میں بزرگی دوگے۔

اس حدیث سے شعراء نے مضامین تلاش کیے ہیں۔

ذوق کا شعر ہے:

اہلِ جوہر کو وطن میں رہنے دیتا گر فلک
لعل کیوں اس رنگ سے آتا بدخشاں چھوڑ کر

ناسخ کہتے ہیں:

ہو وطن میں خاک میرے گوہرِ مضموں کی قدر
لعل قیمت کو پہنچتا ہے بدخشاں چھوڑ کر

غالباً شہیدی کا شعر ہے:

وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا
عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا

امیر مینائی نے اس کے برعکس کہا ہے:

پوچھا نہ جائے گا جو چمن سے نکل گیا
بے کار ہے جو دانت دہن سے نکل گیا

٦٧- اَلْقَرِيْبُ مَنْ تَقَرَّبَ لَا مَنْ تَنَسَّبَ ـــ تیرا قریب (رشتہ دار) وہ ہے جو تیرا قرب چاہتا ہو۔ (تیرا خیر خواہ ہو) نہ کہ وہ جو خاندانی رشتہ رکھتا ہو (اور دل میں دشمن ہو)

حالی کہتے ہیں:

آ رہی ہے چاہِ یوسفؑ سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

٦٨- اِبْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ وَلَا تُلَامُ عَلٰى كَفَافٍ ـ پہلے ان عزیزوں کی خبر گیری کر جن کی پرورش تجھ سے متعلق ہے

اور اگر تیرے پاس تیری احتیاج سے زائد نہ ہو (اور تو دوسرے عزیزوں کی خبر گیری نہ کرے) تو تجھ پر ملامت نہیں۔
مثل مشہور ہے: اول خویش بعدہٗ درویش۔
انگریزی میں بھی ہے کہ:

CHARITY BEGINS AT HOME

۶۹۔ ایک اور حدیث ہے:
خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ لِاَھْلِہٖ ـــــ تم میں وہ بہتر ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو۔ (محبت اور خبر گیری میں)
اور یوں بھی مروی ہے جیسا کہ نظم طباطبائی کا شعر ہے:

لَایُلَامُ الْمَرْءُ فِیْ حُبِّ الْعَشِیْرَۃِ یاد رکھ
پھر ملامت بھی کرے کوئی تو کچھ پروا نہ کر

("پند سود مند")

۷۰۔ خَیْرُالنَّاسِ اَنْفَعُھُمْ لِلنَّاسِ ـــــ آدمیوں میں بہتر وہ ہے جو لوگوں کو نفع پہنچائے۔
ایک اور حدیث ہے:
خَیْرُالنَّاسِ خَیْرُھُمْ لِنَفْسِہٖ ـــــ لوگوں میں جو بہتر ہے (لوگوں سے بھلائی کرتا ہے) وہ اپنے ساتھ بھلائی کرتا ہے (کیونکہ جب لوگوں سے بھلائی کرے گا تو لوگ بھی اس کے ساتھ بھلائی کریں گے)۔
ناسخ کا شعر ہے:

رات دن غافل بدوں سے بھی کیا کر نیکیاں
کیا بُرا ہے اس میں کیا تیرا بھلا ہو جائے گا

داغ کہتے ہیں:

یہ کام نہیں آساں، انسان کو مشکل ہے
دنیا میں بھلا ہونا، دنیا کا بھلا کرنا

۷۱۔ اَلرَّاحِمُونَ یَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمُكُمْ مَنْ فِی السَّمَآءِ ——— رحم کرنے والوں پر رحمٰن بھی رحم کرتا ہے، تم زمین والوں پر رحم کرو تم پر آسمان والا بھی رحم کرے گا۔

حالی کہتے ہیں:

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر

۷۲۔ مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ فَقَدْ رَفَعَهُ اللّٰهُ ——— جو شخص خدا کے لیے انکساری کرے گا خدا اس کا درجہ بلند کرے گا۔

ایک اور حدیث ہے:

طُوبٰی لِمَنْ ذَلَّتْ نَفْسُهٗ وَحَسُنَتْ خَلِیْقَتُهٗ ——— تحسین ہے اُس کے لیے جس نے اپنے نفس کو جھکایا اور جس کے اخلاق اچھے ہوئے۔

ولی کی ایک غزل کے دو شعر ہیں:

نفسِ سرکش پر جو کوئی پایا ہے یاں فتح و ظفر
دارِ عقبیٰ کے بھتر الحق کہ وہ منصور ہے
خاکساری جس کو سلطانی ہے اس عالم منیں
کاسۂ خاکی اُسے جیوں چینیِ فغفور ہے

آتش کا شعر ہے:

غبارِ راہ ہو کر چشمِ مردم میں محل پایا
نہالِ خاکساری کو لگا کر ہم نے پھل پایا

صبا لکھنوی کہتے ہیں:

میری فروتنی مجھے معراج ہو گئی
حاصل ہوا زوال میں رتبہ کمال کا

امیر مینائی کا شعر ہے:

مرتبہ پیشِ خدا ہوتا ہے اتنا ہی بلند
جس قدر ملتا ہے انسان سے انساں جھک کر

۷۳۔ مَنْ تَکَبَّرَ وَضَعَہُ اللّٰہُ ــــ جس نے تکبّر کیا اُسے اللہ نے گرا دیا۔

ولی کا شعر ہے:

عجب کچھ بوجھ رکھتے ہیں سرآمد بزمِ معنی کے
تواضع نہیں ہے جس میں اُس کو انساں کر نہیں گنتے

اسی غزل کا مطلع ہے:

بزرگاں کَن جو کئی اپنے کوں ناداں کر نہیں گنتے
سخن کے آشنا اُن کوں سخنداں کر نہیں گنتے

غرور کا سر نیچا ہوتا ہے۔ مشہور قول ہے:

۷۴۔ یُبْصِرُ اَحَدُکُمُ الْقَذٰی فِیْ عَیْنِ اَخِیْہِ وَیَدَعُ الْجِذْعَ
فِیْ عَیْنِہٖ ــــ تم میں سے کوئی اپنے بھائی کی آنکھ کا

تنکا دیکھ لیتا ہے اور اپنی آنکھ کے شہتیر کو چھوڑ دیتا ہے۔

سرسیّد لکھتے ہیں: "تو اس ذرّے کو جو تیرے بھائی کی آنکھ میں ہے، دیکھتا ہے اور اپنی آنکھ میں جو شہتیر ہے اُس کو نہیں دیکھتا..." (خطباتِ احمدیہ۔ وکیل ٹریڈنگ کمپنی۔ امرت سر صفحہ ۶۷۲)

سرسیّد یوں بھی لکھتے ہیں:

"اگر ہم کسی دوسرے کی آنکھ کی پھُلّی کو ٹوکیں تو اس سے ہماری آنکھ کا ٹینٹ نہیں چھپتا" (تہذیب الاخلاق۔ لاہور ۱۳۱۳ھ ص ۵۵۱)

سودا نے اپنے طور پر یہ مضمون پیش کیا ہے:

حُمق اپنے سے اوروں کے ہُنر کو جو کہے عیب
کیوں کر نہ خطا بینوں کا ہو وے ہدفِ تیر

اسی طرح ناسخ نے بھی:

آپ اپنے عیب سے واقف نہیں ہوتا کوئی
جیسے بو اپنے دہن کی آتی ہے کم ناک میں

کسی جدید شاعر کا شعر ہے:

خود اپنی آنکھ کے شہتیر پہ نظر رکھیں
ہماری آنکھ کے تنکے نکالنے والے

۷۵۔ اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ ___ جنگ ایک حیلہ سازی ہے۔

ذوق کا شعر ہے:

جو کہ ہے الحرب خدعۃٌ اے ذوق لہ
تک اس کی دغا سے لڑائی ہے

۷۶ ۔ لَا تُغْمِدُوا السُّیُوفَ عَنْ اَعْدَائِکُمْ فَتُوتِرُوا ثَارَکُمْ
اپنی تلواروں کو نیام میں مت ڈالو ورنہ تم اپنے دل کے جوش اور اپنے حق کو تباہ کر دو گے ۔

ناسخ کہتے ہیں :

مر رہا ہوں آپ، تم بدنام ہوتے ہو عبث
غصہ جانے دو، کرو تلوار اپنی میان میں

شعور کا شعر ہے :

نہ کر نیام میں تیغِ قضا کو تو اے تُرک
یہی اشارۂ چشمِ رکاب رہتا ہے

۷۷ ۔ مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ وَاسْتَذَلَّ الْاِمَارَةَ لَقِیَ اللّٰہَ وَلَا وَجْہَ لَہٗ عِنْدَہٗ ـــ جس نے جماعت چھوڑ دی اور امیر کی ذلت کی تو اللہ پاک کی ملاقات کے وقت اس کی کوئی عزت نہ ہوگی ۔

ایک اور حدیث ہے :۔ یَدُ اللّٰہِ عَلَی الْجَمَاعَةِ ۔

لہ ذوق کے لامیہ قصیدے میں بھی " اللہ جمیلٌ و یحبُّ الجمال " اور " الجنس یمیلُ الی الجنس " جیسے اقوال نظم کیے گئے ہیں۔

اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے ۔

حالی نے اسی حدیث سے یہ مضمون لیا ہے :

جماعت کی عزت میں ہے سب کی عزت
جماعت کی ذلت میں ہے سب کی ذلت

۷۸ ۔ اَلْفُرْقَةُ عَذَابٌ ـــــ تفرقہ عذاب ہے ۔

ذوق کہتے ہیں :

پڑے تفرقے یہ جُدائی سے تیری
کہ میں ہوں کہیں دل کہیں جاں کہیں ہے

۷۹ ۔ اِتَّبِعُوا السَّوَادَ الْاَعْظَمَ فَاِنَّهٗ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ ـــ

بڑی جماعت کی پیروی کرو ۔ پس جو علیحدہ ہوگا وہ دوزخ میں ڈالا جائے گا ۔

سوادِ اعظم ، بڑی تعداد اور بڑی جماعت کے لیے اُردو میں بولا جاتا ہے جو حق پر ہو ۔

امجد حیدرآبادی کہتے ہیں :

پیروی سے جو سوادِ اعظم کی بہکا وہ کبھی
راہ پائے گا نہیں یوں ہی بھٹکتا جائے گا

۸۰ ۔ كَفٰى بِالْمَوْتِ وَاعِظًا ۔ موت ایک واعظ کے طور پر کافی ہے ۔

اسی مضمون کو ذوق نے اس طرح پیش کیا ہے :

موت نے کر دیا ناچار وگرنہ انساں
ہے وہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا

حالی کے یہ دو شعر اسی مضمون سے قریب ہیں :
کھولی ہیں تم نے آنکھیں اے حادثو ہماری
احسان یہ نہ ہرگز بھولیں گے ہم تمہارا
کردیا چُپ واقعاتِ دہر نے
تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت

اکبر نے اسی سے ملتا جلتا مضمون لیا ہے :
ان مصائب سے کام ہے اکبر
غم بڑا مدرکِ حقائق ہے

۸۱ ۔ اَلْعَیْنُ حَقٌّ ـــــــ نظر کا لگ جانا برحق ہے
نظر لگنا اردو میں مستعمل ہے ۔ غالب کہتے ہیں :
نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

داغ کا شعر ہے :
کچھ روتے ہیں، کچھ مرتے ہیں، کچھ لوٹ رہے ہیں
کس کی نظرِ بد تری محفل کو لگی ہے
نظر لگنا اور نظر کا کھا جانا بھی مستعمل ہے انیس کہتے ہیں :
اٹھارھواں برس تھا کہ موت آ گئی تجھے
اے نورِ عین کس کی نظر کھا گئی تجھے

۸۲ ۔ اَلْمُؤْمِنُ مِرْآۃُ الْمُؤْمِنِ[1] ــــ مومن دوسرے مومن کا آئینہ ہے
آئینہ، حقیقتِ حال ظاہر کرنے کے معنی میں آتا ہے ۔
آتش کا شعر ہے :

قرار اس کو نہیں آتا ہماری بیقراری سے
زمانہ آئینہ ہے اپنے احوالِ دگرگوں کا

محسن کاکوروی کہتے ہیں :

فرحت سے ہُوا یہ قلب بے تاب
آئینہ دکھا رہا تھا سیماب

۸۳ ۔ اَلْھَمُّ نِصْفُ الْھَرَمِ ــــ فکر آدھا بڑھاپا ہے
ھَمّ در اصل اُس فکر کو کہتے ہیں جو مصیبت آنے سے پہلے ہو اور اس سے نیند اچاٹ ہو جائے ۔ اس حدیث سے منیر شکوہ آبادی نے ایک اچھا مضمون پیش کیا ہے :

خوفِ خدا سے رہتی ہے نم، چشمِ پاک ہیں
اطفالِ اشک کیوں نہ ہوں پیرانِ پارسا

۸۴ ۔ تَفَرَّغُوْا مِنْ ھُمُوْمِ الدُّنْیَا مَا اسْتَطَعْتُمْ ــــ دنیا کے رنج و غم سے جس قدر ممکن ہو فارغ رہو ۔
شاعروں نے اس فراغت سے نئے نئے مضامین بنائے ہیں ۔
انیس کا شعر ہے :

---

[1] جناب زکریا مائل نے اس حدیث اور بعض دوسری حدیثوں کا منظوم ترجمہ اخبار انجام کراچی ۔ ۱۹۶۴ء میں "حکمت کے موتی" کے نام سے شائع کیا تھا ۔

سر کٹ گیا ہمیں تو الم سے فراغ ہے
گر ہے تو بس تمھاری جُدائی کا داغ ہے

جلیل کہتے ہیں:

دل مِٹ گیا بلا سے، فراغت تو ہوگئی
اس بے کسی میں چھوٹ گئے بے بسی سے ہم

فارسی میں بھی کہا گیا ہے کہ: ع

فارغ از فکر و غم و وسواس باش

۸۵ ـ اَلْحَزْمُ سُوْءُ الظَّنِّ ــــ (خواہ مخواہ کی) احتیاط، بدگمانی ہے۔
ڈپٹی نذیر احمد لکھتے ہیں: "احتیاط بھی اسی کی مقتضی ہے۔
الحزم سوء الظن"۔ (ابن الوقت فصل ۲۸)

۸۶ ـ اَلرَّفِيْقُ قَبْلَ الطَّرِيْقِ ــــ سفر سے پہلے رفیقِ سفر ڈھونڈ لو۔
امیر مینائی کہتے ہیں:

یہ کس کی راہ میں کھوئے گئے کہ ہم سے خضر
طریق پوچھتے ہیں آکے رہنمائی کا

۸۷ ـ كَرَمُ الْكِتَابِ خَتْمُهٗ ــــ خط کی عزت اس کی مہر ہے
ولی کہتے ہیں

اشک خون آلود ہے سامانِ طغرائے نیاز
مُہرِ فرمانِ وفاداری ہے داغِ عاشقی

ذوق کہتے ہیں:

مہر وہ کرتا ہے نامے پر مجھے آئے ہے رشک

۸۸ - اِنَّ هٰذِہِ الْقُلُوْبَ لَتَصْدَأُ کَمَا یَصْدَأُ الْحَدِیْدُ
بے شک دل بھی زنگ آلود ہوتے ہیں جیسے لوہا زنگ آلود ہوتا ہے۔

اسی مضمون کو سودا نے اس طرح لیا ہے :

عشق بہم پہنچا نہ محرومِ تجلّی، دل کو رکھ
صیقل اس آئینے کی گردِ شکستِ زنگ ہے

ذوق بھی کہتے ہیں :

صفائے دل کی یہی ہے صورت کہ دل میں آنے نہ دے کدورت
کہ بیٹھ جائے گی بالضرورت اس آئینے میں یہ زنگ ہو کر

۸۹ - اِذَا مُدِحَ الْفَاسِقُ غَضِبَ الرَّبُّ تَعَالٰی وَاهْتَزَّ لَهُ الْعَرْشُ
جب فاسق کی تعریف کی جاتی ہے تو اللہ پاک غضب ناک ہوجاتا ہے اور عرش بھی اُس کے غضب سے لرز اُٹھتا ہے۔

حالی نے یہیں سے مضمون لے کر مسدس میں کہا ہے۔

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر ۔۔۔ عفونت میں سنڈاس سے ہے جو بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلے میں برابر ۔۔۔ مَلَک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر
ہوا علم دیں جس سے تاراج سارا
وہ ہے ہفے نظر علم انشا ہمارا

ظفر اپنے انداز میں کہتے ہیں :

کہتے ہیں آپ کو وہ ہنر در زمانے میں
جن پر کبھی پڑا بھی نہیں ہے ہُنر کا عکس

۹۰ - اُحْثُوْا فِیْ وُجُوْهِ الْمَدَّاحِیْنَ التُّرَابَ ـــــ مداحوں (خوشامدیوں) کے منہ میں خاک ڈالو۔

اُردو میں بھی منہ میں خاک ڈالنا محاورہ ہے۔ ذوقؔ کہتے ہیں :

زباں کھولیں گے پھر یہ بد زباں کیا بد شعاری سے
کہ میں نے خاک بھر دی ان کے منہ میں خاکساری سے

سید احمد دہلوی لکھتے ہیں : "تمھارے منہ میں خاک ، تم ایسی فال تو نکالو"
ہادی النسّاء صفحہ ۱۲۲ ۔ لاہور ۱۹۸۳ء

۹۱ - ایک حدیث اس طرح بھی آتی ہے :
رَغِمَ اَنْفُ رَجُلٍ .... مظاہر حق ج ۱ ص ۲ مطبع لکھنؤ ۱۳۱۶ھ
خاک آلود ہو ناک اس شخص کی (جس نے درود نہ بھیجا) ۔
خاک آلود ہو ، خاک پڑے وغیرہ محاورے اُردو میں ہیں ۔
رندؔ کہتے ہیں :

ایسے جینے پہ رندؔ خاک پڑے
موت اس زندگی پہ ہنستی ہے

۹۲ - فَاَسْنَدَ رُكْبَتَيْهِ اِلٰى رُكْبَتَيْهِ وَوَضَعَ كَفَّيْهِ عَلٰى فَخِذَيْهِ ۔
(مظاہر حق ۔ جلد اول ۔ ص ۲۴) [1]
(جبریل علیہ السلام حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے) اور
لگا دیے اپنے دونوں زانو ، حضورؐ کے دونوں زانوؤں کی طرف
اور رکھے اپنے دونوں ہاتھ اپنے دونوں زانوؤں پر ۔
زانو تہ کرنا ، زانوسے ادب تہ کرنا ، دو زانو (ادباً) بیٹھنا
وغیرہ محاورات یہیں سے بنے ہیں ۔
محسنؔ کاکوروی نے سراپا میں لکھا ہے :

---

[1] یہاں سے مظاہرِ حق (تفسیر مشکوٰۃ ۔ طبع لکھنؤ) کے حوالے آئیں گے ۔

سر نزانوے ادب آ کے سخنگو بیٹھیں
فکرِ عالی کے فرشتے بھی دوزانو بیٹھیں

جوش ملسیانی لکھتے ہیں کہ " ان کے شاگرد مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھیں ایسے بلند پایہ اور گراں مایہ استاد کی خدمت میں زانوے ادب تہ کرنے کا شرف حاصل ہوا " (دیباچۂ احسن الکلام)

۹۳۔ خَصْلَتَانِ مُعَلَّقَتَانِ فِیْ اَعْنَاقِ الْمُؤَذِّنِیْنَ لِلْمُسْلِمِیْنَ صِیَامُھُمْ وَصَلٰوتُھُمْ (م۔ ح ۱/۲۳۴)

دو چیزیں لٹکی ہوتی ہیں بیچ گردنوں مؤذنوں کے مسلمانوں کے لیے، ان کے روزے اور ان کی نمازیں۔ (یعنی مؤذنوں کے ذمے ہیں مسلمانوں کے روزے اور نمازیں تاکہ صحیح وقت پر ادا کرسکیں)
گلے بندھنا اور گلے پڑنا، ذمے ہونے کے معنی میں ہے۔

شاہ نصیر کا شعر ہے:

زلفِ خوباں کیوں گلے پڑتی ہے تو
کوئی تیرے دام میں آتے ہیں ہم

بحر کہتے ہیں:

کچھ ایسی گلے پڑ گئی ابرو کی محبت
تلوار کا ڈورا رگِ گردن نظر آیا

۹۴۔ اَبْغَضُ الْبِلَادِ اِلَی اللّٰہِ اَسْوَاقُھَا (م۔ ح ۱/۲۳۶)
اللہ کے نزدیک شہروں کے بہت مبغوض مکان ان کے بازار ہیں۔

اسی حدیث سے اُردو میں سوقیانہ، سوقیانہ پن، بازاری
بازاری پن وغیرہ محاورے بن گئے۔

مولانا شبلی لکھتے ہیں: "ابتذال کا معیار، مذاقِ صحیح کے سوا اور
کوئی چیز نہیں۔ مذاق صحیح خود بتا دیتا ہے کہ یہ لفظ مبتذل،
پست اور سوقیانہ ہے۔" (موازنہ انیس و دبیر)

مولانا عبد السلام ندوی لکھتے ہیں: "شعرائے لکھنؤ کا عام رنگ
معاملہ بندی ہے جس نے حدِ اعتدال سے بڑھ کر بازاری روش اختیار
کر لی ہے۔" (شعر الہند۔ جلد اول۔ دہلی اور لکھنؤ اسکول)

قائم چاندپوری کا شعر ہے:

حسن کو تیرے ہیں یوسف سے مقابل کرتا
کون روکش ہو یہ ہر سوقی و بازاری سے

۹۵۔ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِي ظِلِّهِ (م۔ح ۲۳۴/۱)
رکھے گا اُن کو اللہ اپنے سایہ میں ——— سایہ میں
اپنے کے۔

منیر شکوہ آبادی کہتے ہیں

شفاعت امتِ عاصی کی جب فرمائیں گے حضرتؐ
کرے گا سایہ ہم سب پر ہمانے فضلِ ربانی

شبلی نے اپنے انداز میں کہا ہے:

ہیئت میں بلند پایہ اُس کا
تھا فلسفہ زیرِ سایہ اُس کا

۹۶۔ فَفَاضَتْ عَیْنَاہُ (م۔ ح $\frac{1}{۲۳۸}$) ——— (اللہ کے سایے میں وہ بھی ہوگا جو اس کو تنہائی میں یاد کرتا ہے اور بہتی ہیں اُس کی آنکھیں)

سودا کا شعر ہے
بہنا کچھ اپنی چشم کا دستور ہو گیا
دی تھی خدا نے آنکھ سو ناسور ہو گیا

میر کہتے ہیں:
وہ دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں
سوکھا پڑا ہے اب تو مدّت سے یہ دوآبہ

شبلی نے یوں کہا ہے:
اگرچہ آنکھ میں نم بھی نہیں ہے اب باقی
اگرچہ صدمۂ بلقان سے جگر شق ہے

۹۷۔ رَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَۃٍ فَاَخْفَاھَا حَتّٰی لَا تَعْلَمَ شِمَالُہٗ مَا تُنْفِقُ یَمِیْنُہٗ (م۔ ح $\frac{1}{۲۳۸}$) ———
(اللہ کے سایہ میں وہ شخص بھی ہوگا کہ) جس نے اللہ واسطے کچھ دیا پس چھپایا اس کو یہاں تک کہ نہ جانا اُس کے بائیں

ہاتھ نے کہ اس کے داہنے ہاتھ نے کیا خرچ کیا۔
اُردو میں بولتے ہیں کہ داہنے ہاتھ سے اس طرح دو کہ بائیں
کو خبر نہ ہو۔ کسی کا مصرع ہے: ؎
داہنے سے دو کہ بائیں کو مطلق خبر نہ ہو

عزیز جے پوری نے اس حدیث کو یوں نظم کیا ہے:

ہے یہ ارشادِ سرورِ بطحا
اپنی امت کے اہلِ ثروت کو
دو اگر ایک ہاتھ سے خیرات
دوسرے ہاتھ کو خبر بھی نہ ہو

۹۸۔ فَوَضَعَ كَفَّهُ بَيْنَ كَتِفَيَّ (م۔ح $\frac{1}{۲۴۴}$)
پس رکھا اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ میرے مونڈھوں کے
درمیان ـــ پیٹھ پر ہاتھ رکھنا، پیٹھ تھپکنا وغیرہ محاورے
ہیں۔ پیٹھ ٹھونکنا بھی آتا ہے۔ گلزارِ نسیم کا شعر ہے:

لے لے کے بلائیں کا کلوں کی
پیشانی پہ چومی پیٹھ ٹھونکی

۹۹۔ فَأَمِيتُوهُمَا طَبْخًا (م ح $\frac{1}{۲۴۴}$)
پس مارو اُن کو پکا کر (یعنی پیاز اور لہسن کی بُو کو)۔
آتش کا شعر ہے:

بیتاب دل کو تسکین ہوتی ہے دیدِ خط سے
وہ بوٹی ہے یہ جس سے پارے کو مارتے ہیں

ناسخ بھی کہتے ہیں :

تیرے آگے نہ چلے جانِ سیہ مار کے پیچ
زُلفِ پیچاں نے اسے مار رکھا مار کے پیچ

ایسی بکثرت احادیث اُردو نثر اور اُردو شعر میں مستعمل ہیں اور یہ ننانوے احادیث اردو میں بالخصوص رائج ہیں۔ کاش ان کا ابلاغ اس عاجز کے لیے ذریعۂ مغفرت بن جائے!

گر بد ہیں تو حق اپنا ہے کچھ تجھ پہ زیادہ
اخبار ہیں "اَلطَّالِحُ لِی"، ہم نے سنا ہے

(حالی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآنی صنائع وبدائع

اسلام نے دنیا کو بے شمار نعمتیں اور بکثرت علوم وفنون عطا کئے کہ دنیا ان سے پہلے آشنا بھی نہ تھی۔ خود قرآن ایک چیلنج پیش کرتا ہے کہ :۔

وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ٥

(اور اگر تم شک میں ہو اس سے جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو بنالاؤ اس جیسی کوئی سورت اور لے آؤ اپنے گواہ، اللہ کے سوا، اگر تم سچے ہو)۔

سورۂ بنی اسرائیل میں ہے :

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ٥۔

(آپ فرمادیں کہ اگر انسان اور جن اس بات پر اتفاق کریں کہ اس قرآن جیسی کتاب بنائیں تو نہیں بنا سکتے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ قرآن اپنی ظاہری اور معنوی خوبیوں کی وجہ سے ہر طرح بے مثل ہے اور یہ حقیقت ہے کہ سبعہ معلقات والے شعراء اور ادباء بھی اس کے متعلق ماھذا قول البشر، (یہ انسان کا کلام نہیں ہے) کہنے پر مجبور تھے۔ قرآن کے طفیل میں ادبی لطافت اور عذوبت میں خود عربی ادب میں چلا پیدا ہوئی اور بکثرت قرآنی بحور مقبول ہوئے۔ دیکھئے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ بحر سریع میں ہے اور مفتعلن مفتعلن فاعلات

اس کا وزن ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے۔ قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يَاسَامِرِيُّ بھی اسی وزن میں ہے۔ پھر عربی اور بالخصوص فارسی میں بکثرت مثنویاں یعنی نظامی، جامی فیضی وغیرہ نے اسی بحر میں طویل مثنویاں لکھیں۔ اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ بحر متدارک میں ہے۔ یعنی فعلن، فعلن، فعلن، فعلن۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا۔ بحر رمل میں ہے۔ یعنی فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلن۔ اس بحر میں بھی بہت سی مثنویاں لکھی گئیں۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ بحر طویل میں ہے۔ یعنی فعولن، مفاعیل، فعولن، مفاعیل۔ وَاُمْلِىْ لَهُمْ اِنَّ كَيْدِىْ مَتِيْنٌ بحر متقارب میں ہے یعنی فعولن، فعولن، فعولن، فعول۔ تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا، یہ بحر ہزج میں ہے۔ یعنی مفعول، مفاعیل، مفاعیل، فعولن۔ يَوْمَ التَّنَادِ يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ اس کا وزن ہے۔ مفعول، فاعلات، مفاعیل، فاعلان۔ لِيَقْضِىَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا کا وزن مفاعلن، فاعلن، مستفعلن، فعلن ہے۔ وَاللّٰهُ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ کا وزن مستفعلن مستفعلن، متفاعلن، مستفعلان ہے۔

قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت کی مقبولیت کی وجہ سے اس آہنگ کا رواج عام ہوا اور عربی، ترکی، فارسی وغیرہ زبانوں میں ان بحور کا استعمال اس قدر مقبول ہوا کہ بڑے سے بڑا شاعر بھی ان کے استعمال کو اپنے لئے بلکہ ادب کے لئے بہت بڑی نعمت سمجھتا تھا۔

پھر نثر کے مرصع اسلوب کی تعمیر و تشکیل میں بھی قرآن پاک کی برکات نظر آتی ہیں:- (۱) مرجز (۲) مسجع یعنی مقفیٰ اور (۳) عاری۔

(۱) مرجز وہ نثر ہے جس میں دو فقروں کے اکثر کلمات ہم وزن ہوں۔ اس میں قافیے کی پابندی ضروری نہیں اور اگر یہ پابندی بھی ہو جائے تو نورٌ علیٰ نور۔

قرآن پاک ایسی مرجز نثر سے پر ہے۔ مثلاً : كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۝ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍۢ بَاسِرَةٌ ۝ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ۝

فارسی میں بھی مرجز نثر ملتی ہے۔ مثلاً : خیالِ ناظم بے تعلق قامت، دل ربائے ناموزون است و قیاسِ ناثر بے تمسکِ کاکل مو میانے نامربوط

لیکن مسجع اور مقفیٰ نثر قرآن پاک میں اس شان سے آتی ہے، کہ جو شخص عربی بھی نہیں جانتا، وہ بھی مزے لیتا ہے۔ مثلاً سورہ التکویر اس طرح شروع ہوتی ہے : اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۝ وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝ وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝ وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۝ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝ وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۝ وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝

مقامات حریری، مقاماتِ حمیدی، اعجازِ خسروی، نثر ظہوری، دریائے لطافت کے بھی بعض مقامات ایسی مسجع نثر کی تقلید میں ہیں۔ ان محاسن کے علاوہ صنائع وبدائع کا ایک وافر ذخیرہ قرآنی برکات سے مستفیض ہے۔ قرآن پاک کے ان محاسن کا ایک سرسری جائزہ بھی لیا جائے تو ایشیا اور بالخصوص اسلامی دنیا کے ادب کا پس منظر صاف طور پر نظر آجائے گا۔ صنائع لفظی میں ایک مشہور صنعت تجنیس ہے۔ اس کی بہت سی قسمیں ہیں۔ مثلاً ایک قسم مزاوجہ ہے کہ الفاظ کے جوڑے استعمال کئے جاتے ہیں۔ مثلاً :

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ

ایک تجنیسِ تماثل ہے یعنی الفاظ ایک ہی اصل سے تعلق رکھتے ہوں۔ جیسے :

فَرَوْحٌ وَرَيْحَانٌ
وَجَنَى الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ

ایک قسم تجنیس تصحیف ہے جس میں دو لفظ ایک جیسے لکھے جاتے ہیں لیکن ان کے نقطوں میں فرق ہوتا ہے۔

مثلاً: وَهُمْ يَحْسَبُونَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا

ایک قسم تجنیس تحریف ہی جس میں دو لفظ ایک جیسے لکھے جاتے ہیں لیکن ان میں معنی کے لحاظ سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ مثلاً:۔

اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ
وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ
مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ

تجنیس تصریف ایک صنعت ہے جس میں دو حرفوں کا اختلاف قریب المخرج ہونے کی وجہ سے ہے جیسے:۔

وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْئَوْنَ عَنْهُ (الانعام ۲٦)

ایک تجنیس التبدیل کہلاتی ہے کہ دو لفظوں کے شروع، درمیان یا آخر میں کسی حرف کی کمی یا زیادتی ہو جیسے:۔

شروع میں کمی یا زیادتی: وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِنِ الْمَسَاقُ

ایک لفظ کا درمیانی حرف دوسرے حرف کے آخر میں آئے:

(۲) ان تقول فرقت بين بنى اسرائيل

آخر میں کمی یا زیادتی: (۳) ثُمَّ كُلِىْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ

لفظوں کے درمیان میں فرق ہو: (۴) وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝

ایک صنعت قلب یا انقلاب کہلاتی ہے۔ یعنی ایک لفظ کے حروف کو الٹ پلٹ کر کے دوسرا لفظ کر دیا جائے۔ اگر حروف کو ترتیب کے ساتھ پلٹا جائے تو اسے قلبِ کُل کہتے ہیں۔ جیسے برق، قرب، عرش، شرع، بر، رب، نوع، عون وغیرہ۔ اس پلٹنے میں ترتیب ملحوظ نہ ہو اسے مقلوب بعض کہتے ہیں جیسے: علم، عمل، کلام، کمال، رحیق، حریق، حامی، ماحی، محروم، مرحوم وغیرہ۔ اگر ایک فقرہ یا مصرع ترتیب حروف کے ساتھ پلٹا جائے تو اسے مقلوبِ مستوی کہتے ہیں۔

جیسے: نون، تبتت، الا، انا، موہوم وغیرہ۔

كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ   رَبَّكَ فَكَبِّرْ

قوامی مطرزی نے مقلوب مستوی میں فارسی میں خوب شعر کہا ہے:-

رامش مرد گنج باری وقوتش   توقوی راجنگ درشمار

فارسی کا یہ فقرہ بھی مشہور ہے:-

شکر بتر از روے وزارت برکش

ایک صنعت طباق کہلاتی ہے یعنی ایسے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں جو عموماً آپس میں ایک دوسرے کی ضد ہوں جیسے:-

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى (البقرہ ۱۶)

تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ (المائدہ ۱۱۶)

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ (الانعام ۱۲۲)
اس صنعت کی مثالیں بہت سی زبانوں میں بکثرت ملتی ہیں۔

ردّ العجز علی الصّدر

کسی عبارت کے جزو اول کو صدر اور جزو آخر کو ضرب یا عجز کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ایسی متعدد مثالیں ہیں جہاں عجز کو صدر بنایا گیا ہے۔ مثلاً :-

قَالَ اِنِّیْ لِعَمَلِکُمْ مِنَ الْقَالِیْنَ
وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ
وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝
اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَ لَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّ اَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ۝

امیر خسرو کہتے ہیں :-

نبود امشب مرا سوزندہ چون تپ — دل ارچہ بود ولیکن بدست خویش نبود

ولی کا شعر ہے :-

دلربا آیا نظر میں آج میری خوش ادا !
خوش ادا ایسا نہیں دیکھا ہوں دو جا دلربا

صنعت تکرار۔ کبھی کبھی تکرار لفظی سے بھی کلام میں زور اور حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسے سورۂ رحمٰن میں فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۝ کے بار بار آنے سے

صوتی حسن اور آہنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح متعدد مقامات ہیں۔ جیسے :۔

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝

اَلْحَآقَّةُ مَا الْحَآقَّةُ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ۝

اَلْقَارِعَةُ مَا الْقَارِعَةُ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝

كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝

فارسی اور اردو میں بھی ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً داغ کا شعر ہے

نا روا کہیے نا سزا کہیے۔ کہیے کہیے مجھے برا کہیے

صنعت التفات۔ یعنی کوئی بات کہہ کر فوراً معترض کا رد کر دیا جائے، جیسے:

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ ..... (البقرہ-۲۴)

پھر اگر تم نہ کرو اور البتہ نہ کروگے تو ڈرو آگ سے ....

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ ۔ (البقرہ - ۱۹۴)

پھر جس نے زیادتی کی تم پر، تم اس پر زیادتی کرو۔

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ (الانعام-۶)

کیا وہ نہیں دیکھتے کتنی ہلاک کیں ہم نے پہلے ان کی جماعتیں، ان کو جمایا تھا ہم نے ملک میں، جتنا کہ تم کو نہیں جمایا۔

تجاہل العارف ۔ یعنی کوئی بات اس طرح کہی جائے، جس سے بظاہر معلوم ہوتا ہو کہ کہنے والا وہ بات نہیں جانتا، حالانکہ وہ جانتا ہے۔ مثلاً :۔

أَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهُ (القمر ۲۴)

(پھر کہنے لگے کہ) کیا ایک آدمی ہم میں کا اکیلا؟ ہم اس کے کہے پر چلیں گے؟)

ءَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَٰهَيْنِ مِن دُونِ اللَّهِ۔ (المائدہ ۱۱۶)

(اے عیسیٰ! کیا تو نے کہا تھا لوگوں کو کہ ٹھہراؤ مجھ کو اور میری ماں کو دو معبود اللہ کے سوا؟)

ءَأَنتَ فَعَلْتَ هَٰذَا بِآلِهَتِنَا يَا إِبْرَاهِيمُ (الانبیاء ۶۲)

(بولے) کیا تو نے کیا ہے یہ ہمارے معبودوں پر اے ابراھیم!)

مَا هَٰذَا بَشَرًا إِنْ هَٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ ۝

(نہیں یہ شخص آدمی، یہ تو کوئی فرشتہ ہے)

السّلب والایجاب

(کسی بات کی نفی کرکے پھر کسی بات کے لئے ہاں کہنا)۔

فَلَا تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا

(بنی اسرائیل ۲۳)

(پس تو نہ کہہ ان دونوں کو اُف اور نہ جھڑک ان کو اور کہہ ان کو بات ادب کی)

فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ ط (المائدہ ۴۴)

(پس مت ڈرو لوگوں سے اور مجھ سے ڈرو)

لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ۝ (التحریم ۶)

(حکم عدولی نہیں کرتے اللہ کی، جو بات ان کو فرمائی گئی اور وہی کرتے ہیں جو حکم ہو)۔

پھر تشبیہات و استعارات نیز ان کی اقسام، ان صنائع کے علاوہ ہیں

ان کے متعلق بکثرت علما کی کتابیں موجود ہیں۔ اور یہ وہ حقائق ہیں جن کا تعلق صرف حقائق والی کتاب (قرآن) سے ہے اور جس کی فصاحت و بلاغت کا لوہا آج بھی مانا جاتا ہے۔ زورِ بیان، اندازِ بیان، صوت و آہنگ، فنی اور عروضی نکات اسی صحیفۂ مبارک کے طفیل میں بہت سی زبانوں میں جاری ہیں۔ حالانکہ قرآن کا تعلق شعر و ادب سے نہیں ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر ادب اُس کی سند لینے ہی مستند بن جاتی ہے۔ اقبال نے صحیح کہا ہے کہ ؏

نیست ممکن جز بقرآن زیستن

احادیث میں صنائع وبدائع

افصح العرب والعجم رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک کی گہرافشانی سے ادب کے خزینے تیار ہوتے ہیں اور آپؐ کے سحابِ بخشش سے بکثرت علوم وفنون کی کشتِ ویران سیراب وشاداب ہوتی ہے۔ یہاں چند احادیثِ مبارکہ سے مختلف صنائع وبدائع کے محاسن پیش کیے جاتے ہیں:۔

(۱) احادیث میں مرجز عبارتیں ایسی حسین ہیں کہ ان کا جواب بمشکل نظر آئے گا۔ مثلاً:۔

كَلِمَتَانِ خَفِيفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيلَتَانِ فِي الْمِيزَانِ حَبِيبَتَانِ إِلَى الرَّحْمٰنِ (۱) سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ (۲) سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ۔

(دو کلمے ایسے ہیں جو زبان پر بہت ہلکے ہیں مگر (قیامت کے دن) ترازو میں بھاری ہوں گے (اور) وہ اللہ تعالیٰ کو بہت پیارے ہیں):

(۱) سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ (۲) سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ۔

ایسی مرجز عبارتیں حدیث کی دعاؤں میں بھی ہیں۔ مثلاً:۔

(الف) أَوْبًا أَوْبًا لِرَبِّنَا تَوْبًا لَا يُغَادِرُ عَلَيْنَا حَوْبًا۔

(ب) آيِبُوْنَ تَائِبُوْنَ عَابِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ

(۲) مسجع اور مقفیٰ عبارتیں بھی بہت آتی ہیں۔ مثلاً:۔

(الف) أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ شَرِّ كُلِّ شَيْطَانٍ وَهَامَّةٍ وَمِنْ شَرِّ كُلِّ عَيْنٍ لَامَّةٍ۔

(ب) رَبِّ أَعْطِ نَفْسِيْ تَقْوٰهَا وَزَكِّهَا أَنْتَ خَيْرُ مَنْ زَكّٰهَا،

اَنْتَ وَلِيُّهَا وَ مَوْلٰهَا ....

ج) اَللّٰهُمَّ لَكَ رَكَعْتُ وَبِكَ اٰمَنْتُ وَ لَكَ اَسْلَمْتُ

د) اَلرَّفِيْقُ قَبْلَ الطَّرِيْقِ ۔

ہ) اَلرِّضَاعُ يُغَيِّرُ الطِّبَاعَ

③ عربی میں اشتقاق سے بھی بہت حسن پیدا ہوتا ہے۔ حدیث میں بھی اشتقاق کی بکثرت مثالیں ہیں۔ اس کو تجنیسِ تماثل بھی کہتے ہیں۔ مثلاً :-

(الف) مَنْ خَافَ اللّٰهَ خَوَّفَ اللّٰهُ مِنْهُ كُلَّ شَيْءٍ

جو اللہ کا خوف کریگا، اللہ ہر چیز کو اس سے خوف دلائے گا

(ب) اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنِيْ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۔

اے اللہ تو میرا حساب آسانی سے لیجیو۔

(ج) اَللّٰهُمَّ اهْدِنِيْ فِيْمَنْ هَدَيْتَ وَعَافِنِيْ فِيْمَنْ عَافَيْتَ وَ تَوَلَّنِيْ فِيْ مَنْ تَوَلَّيْتَ .....

④ تجنیسِ لفظی میں ایک صنعت مزاوجہ ہے جس میں الفاظ کے جوڑے استعمال کیے جاتے ہیں۔ مثلاً:

(الف) اِنَّ لِلْقُرْاٰنِ ظَهْرًا وَّ بَطْنًا وَ لِلْبَطْنِ بَطْنٌ اِلٰى سَبْعَةِ بُطُوْنٍ

(ب) عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ خُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ مِنْ بَعْدِيْ

(ج) عَلَيْكُمْ بِالسَّوَادِ الْاَعْظَمِ فَاِنَّهٗ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ

(د) اِنَّ الشَّيْطَانَ ذِئْبُ الْاِنْسَانِ كَذِئْبِ الْغَنَمِ

⑤ تجنیسِ محرّف کی مثالیں بھی احادیث میں ملتی ہیں۔ مثلاً

(الف) يَمُوْتُ الْعَالِمُ فَيَذْهَبُ بِمَا يَعْلَمُ فَتَبْقٰى الْجُفَاةُ فَيَضِلُّوْنَ وَيُضِلُّوْنَ ۔

(ب) اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَضِلَّ اَوْ اُضَلَّ اَوْ اَزِلَّ اَوْ اُزَلَّ

أَوْ أَظْلِمَ أَوْ أُظْلَمَ أَوْ أَجْهَلَ أَوْ يُجْهَلَ عَلَيَّ

(ج) اَللّٰهَ اَللّٰهَ فِي أَصْحَابِي لَا تَتَّخِذُوهُمْ غَرَضًا مِنْ بَعْدِي فَلَوْ أَنْفَقَ أَحَدُكُمْ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا مَا بَلَغَ مُدَّ أَحَدِهِمْ وَلَا نَصِيفَهُ۔

(د) اَللّٰهُمَّ أَنْتَ حَسَّنْتَ خَلْقِي فَحَسِّنْ خُلُقِي۔

⑥ صنعتِ تصحیف کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً:۔

(الف) وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا تَحَسَّسُوا (نہ جاسوسی کرو، نہ حاسوسی)

جاسوسی دوسرے کے ٹوہ لگانا اور حاسوسی خود اپنے لئے۔

(ب) أَذْهِبِ الْبَأْسَ رَبَّ النَّاسِ (دور کردے تکلیف کو اے لوگوں کے پروردگار)

(ج) الشُّقَّةُ بَعِيدَةٌ وَالسَّيْرُ بَطِيءٌ (منزل تو دور ہے اور چال سست ہے)

⑦ تجنیس تحریف یا تجنیس مضارع کی بھی بہت مثالیں ہیں۔ مثلاً:۔

(الف) اَللّٰهُمَّ بِكَ أُحَاوِلُ وَبِكَ أُصَاوِلُ ......

(ب) اَللّٰهُمَّ حَوَالَيْنَا وَلَا عَلَيْنَا اَللّٰهُمَّ عَلَى الْآكَامِ وَالْآجَامِ...

(ج) تَوْبًا تَوْبًا لِرَبِّنَا أَوْبًا۔

(د) اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ مِنَ الْخَيْرِ كُلِّهِ عَاجِلِهِ وَآجِلِهِ۔

⑧ صنعتِ تکرار سے بھی عبارت میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً:۔

(الف) اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِي قَلْبِي نُورًا وَفِي بَصَرِي نُورًا وَفِي سَمْعِي نُورًا وَعَنْ يَمِينِي نُورًا وَعَنْ شِمَالِي نُورًا وَخَلْفِي نُورًا وَاجْعَلْ لِي نُورًا

(ب) اَللّٰهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ وَإِلَيْكَ يَرْجِعُ السَّلَامُ فَحَيِّنَا رَبَّنَا بِالسَّلَامِ وَأَدْخِلْنَا دَارَ السَّلَامِ تَبَارَكْتَ

وَتَعَالَيْتَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ

(ج) لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ
لَا شَرِيْكَ لَهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ
وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ

(۹) مقلوب بعض کی بھی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً :-

(الف) اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِنَا وَآمِنْ رَوْعَاتِنَا۔

(اے اللہ تو ہماری کمزوریوں کو چھپا لے اور ہمارے خوف کو امان دے)

(ب) اَللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا عَامِلِيْنَ

(اللہ خوب جانتا ہے کہ یہ بچے جو بچپن میں مر گئے بڑے ہو کر کیسے کام کرتے)

(ج) مَا مِنْ نَبِيٍّ إِلَّا أُعْطِيَ مِنَ الْآيَاتِ مَا مِثْلُهُ آمَنَ عَلَيْهِ
الْبَشَرُ وَإِنَّمَا كَانَ الَّذِيْ أُوْتِيْتُهُ وَحْيًا أَوْحَاهُ اللّٰهُ إِلَيَّ

ہر پیغمبر کو ایسی نشانیاں ملیں جن پر لوگ اس سے پہلے ایمان لا چکے تھے مگر
مجھ کو جو دیا گیا ہے وہ خدا کی وحی ہے جو اس نے میری طرف بھیجی ہے۔

(۱۰) صنعتِ طباق کی مثالیں بھی بہت ہیں۔ مثلاً :-

(الف) مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ۔

جو شخص اللہ کے لیے جھکا اللہ اس کو اونچا کر دے گا۔

(ب) مَنْ تَكَبَّرَ وَضَعَهُ اللّٰهُ ، جس نے تکبر کیا، اسے اللہ نے گرا دیا۔

(ج) اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ مَا أَسْرَرْتُ وَمَا أَعْلَنْتُ

اے اللہ بخش دے جو کچھ میں نے چھپ کر کیا ہو اور جو علانیہ کیا ہو۔

(۱۱) تشبیہات اور استعارات میں بھی بڑی لطافت اور دلکشی پائی جاتی ہے

مثلاً :-

(الف) رُوَيْدَكَ سَوْقَكَ بِالْقَوَارِيْرِ۔

آہستہ آہستہ لے چل جیسے تو آبگینوں (شیشوں) کو لے جاتا ہے۔

شیشوں سے مراد وہ خواتین ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے انجشہ سے اس طرح فرمایا تھا جو گا گا کر (حُدی خوانی کرکے) اونٹوں کو بھگا رہے تھے اور ان پر خواتین سوار تھیں۔

(ب) اِیَّاکُمْ وَخَضْرَاءَ الدِّمَنِ۔

میں تم کو گھورے کی سبزی سے ڈراتا ہوں (یعنی خوبصورت لیکن بدسیرت عورت سے)

(ج) اَسْرَعُکُنَّ لِحَاقًا بِیْ اَطْوَلُکُنَّ یَدًا۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے فرمایا "تم میں سے میرے ساتھ جلد تر ملنے والی وہ بی بی ہے، جس کا ہاتھ زیادہ لمبا ہے (جو زیادہ سخی ہیں) حضرت زینب رضی اللہ عنہا بنت جحش سب سے زیادہ سخی تھیں، اس لئے وہ سب سے پہلے فوت ہوئیں۔ حالانکہ ہاتھ کی لمبائی حضرت سودہ کی سب سے زیادہ تھی۔

(د) اَلْیَدُ الْعُلْیَا خَیْرٌ مِّنَ السُّفْلٰی

اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے۔

(ہ) حُبُّکَ الشَّیْءَ یُعْمِیْ وَیُصِمُّ۔

کسی چیز کی محبت تجھے اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے۔

یہ چند صنائع و بدائع ہیں۔ تلاش کرنے سے اور بھی مل سکتے ہیں

وَصَلَّی اللّٰہُ عَلَی النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَعَلٰی

اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ،

تہذیبِ جدید کا فکری بُحران

اُردو ادب کے آئینے میں

انجیل میں آتا ہے کہ..........

"جو شخص تمہارے داہنے گال پر طمانچہ مارے اُس کے سامنے دوسرا گال بھی پیش کر دو۔ جو شخص لڑنے جھگڑنے میں تمہارے کپڑے پکڑ لے۔ اس کو چادر بھی دے دو۔ جو شخص تم کو ایک میل تک بیگار میں پکڑ کر لے جائے اُس کے ساتھ دو میل تک چلے جاؤ۔"

(متی۔ باب ۵)

عام عیسائی تو کیا، کسی باعمل عیسائی یا پادری کے ایک گال پر تھپڑ مار کر دیکھیے یا اُسے ایک میل تک بیگار میں لے جائیے تو معلوم ہو جائے گا کہ انجیل کے حکم پر اس کا عمل کہاں تک ہے یعنی یہ تعلیم ایسی ہے جس پر عیسائی عوام تو کیا خواص بھی عمل نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ میں جب اٹھارھویں صدی عیسوی سے علمی بیداری عام ہونے لگی۔ تو ایسے کمزور دین کے

خلاف مختلف گوشوں سے آوازیں اٹھنے لگیں۔
Bishop Berkeley (م ۱۷۵۳ء) نے اُس آواز کے
خلاف یعنی دین کی حمایت میں اور مادیت کی مخالفت میں اپنے
Dialogues کے علاوہ Principles of Human
Knowledge کتاب بھی لکھی۔ اور مختلف فلاسفہ نے زندگی
کے حقائق پر از سرِ نو غور وخوض کیا اور اپنے اپنے طور پر
راہیں تلاش کیں۔ David Hume (م ۱۷۷۶ء)۔ اور
Voltaire (م ۱۷۷۸ء) پھر۔ Kant (م ۱۸۰۴ء)۔۔۔۔۔
Hegel (م ۱۸۳۱ء) Schopen Hauer (م ۱۸۶۰ء)
Emerson (م ۱۸۸۲ء) Nietzsche (م ۱۹۰۰ء)
وغیرہ پے درپے بڑے بڑے فلاسفہ اسی زمانہ میں ہوئے۔
اور انہوں نے اپنے نقطۂ نظر سے زندگی کے حقائق کی ترجمانی
کی۔ لیکن موخر الذکر یعنی Nietzsche نے اُس دین پر بھرپور
حملہ کیا۔ اور اس کے خلاف نسلی اور جسمانی قوت کی صلاحیتوں
پر زور دیا۔ اُس کے یہاں Common man (۱)۔۔۔۔۔
Higher man (۲) اور (۳) Super man کی تقسیم
اسی لیے ہے۔ بہر حال اس دین میں کوئی دم خم تو تھے نہیں۔ وہ
بہت جلد ہار مان گیا۔ اور اس پر عمل صرف اتنا رہ گیا۔ کہ اتوار
کے دن اچھے کپڑے پہن کر کلیسا میں حاضری دے دی جائے۔
اور Christmas Day میں عیش منا لیا جائے۔

لیکن ایسے دین کے ساتھ ہی فلسفے نے بھی اپنی طاقت
کھودی، کیونکہ فلسفے میں عمل سے دوری اور حرکت سے بُعد
ہوتا ہے۔ چنانچہ اب یورپ نے مادیات کی طرف رُخ کیا اور

معاشیات، اجتماعیات اور سیاسیات پر اپنا زور صرف کیا اور اس کے لئے ادب کو بھی آلۂ کار بنا لیا۔ اب مشینوں کے دھوئیں سے وہاں کی فضا تاریک و مکدّر ہو گئی۔ اور اُس کے نتیجے میں سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش اور آویزش شروع ہو گئی اور چونکہ وہاں حرفِ[۱] قُلِ الْعَفْوْ کے سننے اور سمجھنے کی صلاحیت نہ تھی۔ اس لئے ردِّ عمل کے طور پر ایک نئے نظریئے کا آغاز ہوا۔ جسے اشتراکیت کہا جاتا ہے۔ اور جس کا بانی ——— Karl Marx ہے۔ لیکن اُس کے پہلے بھی اسی زمانے میں (یعنی اُٹھارہویں اور انیسویں صدی میں) کچھ اور لوگوں نے معاشی ناہمواری سے اکتا کر سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کی تھی مثلاً St. Simon (۱۷۶۰ء۔۱۸۲۵ء) یہ فرانسیسی سوشلسٹ تھا۔ اس کی تحریروں کا حاصل یہ ہے کہ پیداوار کے تمام ذرائع حکومت کے قبضہ میں ہونے چاہئیں۔ گویا اس کا نظریہ "State Socialism" کا ابتدائی خاکہ تھا۔

(۲) Fourier (۱۷۷۲ء۔۱۸۳۷ء) یہ بھی فرانسیسی تھا اور ایک تاجر کا ایجنٹ تھا۔ تجارتی معاملات کی بدحالی سے متاثر ہو کر اُس نے Phalanx کی تجویز پیش کی تھی۔ یعنی قریب اٹھارہ سو

---

[۱] اقبال نے روس کی سویت (مساوی حقوق کے ظاہری دعویٰ) سے متعلق کہا ہے جو حرف قُلِ العفو میں پوشیدہ ہے ابتک سورۃ البقرہ میں ہے۔ ویسئلونک ماذا ینفقون ط قل العفو (اور لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ خرچ کریں آپ فرما دیں کہ تمہ کچھ (ضرورت سے) بڑھ رہے ہے۔ یعنی خالص ضرورت سے جو کچھ زیادہ ہو وہ دوسروں کے لئے خرچ کیا جائے۔

آدمیوں کی Socialist Community کے قیام
کی تجویز تھی۔ لیکن اُس کی تجویز کردہ ایسی جماعت کی بستیاں
آج تک قائم نہ ہو سکیں۔

(۳) Robert Owen (۱۷۷۱-۱۸۵۸ء) یہ شخص
انگلستان کا تھا۔ ایک کارخانے کا مالک اور منتظم رہ چکا تھا۔
اس لئے اُس نے سرمایہ داروں اور مزدوروں کے مسئلے پر
زیادہ کامیاب بحث کی ہے۔ امداد باہمی کا اصول بھی اسی کا
وضع کردہ ہے جو آج بھی جاری ہے۔

(۴) Louis Blane — (۱۸۱۳-۸۸۲ء) یہ بھی
فرانسیسی تھا۔ اُس کا نظریہ تھا کہ حکومت اپنے سرمائے سے قومی
کارخانے کھولے، اُن کے لئے تمام سامان فراہم کرے۔ اور کچھ
عرصہ کے بعد یہ کارخانے خود مختار کر دیئے۔ یعنی آمدنی، خرچ
اور انتظامات اُن کارخانوں کے کارکنوں اور مزدوروں کے
سپرد ہوں اس کا خیال تھا۔ کہ اس طرح سرمایہ داری کی تمام
خرابیاں دُور ہو جائیں گی۔

ان لوگوں کے علاوہ دوسرے مفکر بھی تھے۔ جنھوں نے اپنے
اپنے خیال کے مطابق اقتصادی بدحالی کا حل پیش کیا۔ لیکن
موجودہ اشتراکیت کا باوا آدم کارل[1] مارکس ہی سمجھا جاتا ہے۔

---

[1] ۱۸۸۲ء میں مارکس کا مرتب کردہ "Communist Manifesto" شائع ہوا جو آج تک اس جماعت کا لائحہ عمل بنا ہوا ہے اس وقت سے یہ جماعت Communist کہلاتی ہے اور اس سے پہلے والی جماعتیں Socialist کہلائی جاتی تھیں۔

Karl Marx (۱۸۱۸ء-۱۸۸۲ء) نے مذکورہ بالا نظریات سے بھی فائدہ اٹھایا اور اخلاق، تمدّن و تہذیب کا ایک جدید فلسفہ تیار کیا۔ یعنی لادینی کے پردے میں روٹی، مساوات، ترقی پسندی اور قومی ملکیت کے اصول مرتب کیے۔ اس کی خاص کتاب "Das Capital" ہے۔ جس کی پہلی جلد اس کی زندگی میں شائع ہو گئی تھی۔ لیکن بقیہ دو جلدیں اس کے بعد اس کے رفیق کار Fried Engels (۱۸۲۰ء-۱۸۹۵ء) نے شائع کیں۔ یہ کتاب یوں تو سوشلسٹ کا صحیفہ ہے۔ مگر اعداد و شمار کے انبار اور طرز بیان کے اُلجھاؤ سے وہ ایک چیستان بن گئی۔ اس لیے علامہ اقبال نے اس کے متعلق کہا ہے ؎

تری کتابوں میں اے حکیم معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوطِ خمدار کی نمائش، مریز و کجدار کی نمائش

مارکس نے سرمایہ داری نظام اور بورژوا طبقے کی حاکمیت کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے اور مزدوروں یا پرولتاریوں کی حکومت، قائم کرنے کا منظم طریقۂ کار پیش کیا۔ اور بتایا کہ انسانی معاشرے کی تاریخ دراصل طبقاتی آویزش کی تاریخ ہے۔ اور جاگیردارانہ نظام کو تباہی کے بعد سرمایہ دارانہ نظام وجود میں آیا تو اس نے ظلم و ستم کے نئے طریقے ایجاد کیے اور پرولتاری یعنی مزدور طبقے کو اپنا غلام بنانے کے لیے مذہب، اخلاق، قانون اور رسم و رواج جیسی چیزیں مسلط کر دیں۔ تاکہ ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام لیا جا سکے۔ تاہم مارکسی نظریہ اور اُس کا Manifesto اپنے بلند آہنگ دعووں کے باوجود، لینن، اسٹالن اور خروشیف کی ترمیمات سے اپنا تقدس کھو چکا ہے

کیونکہ عملی زندگی میں اجتماعی مفاد کے نام پر افراد کی ہر آزادی اور ہر قسم کی شخصیت ہمیشہ کے لئے ختم ہو جانے کے باوجود بڑے اور چھوٹے کی تمیز اب بھی ہے۔ روس میں تمام کارخانوں اور اداروں میں معمولی مزدوروں اور اعلیٰ افسروں کی تنخواہوں میں اسی قدر فرق ہے۔ جس قدر سرمایہ دارانہ نظام میں ہے اور اسی طرح ان کے معیار زندگی میں فرق پایا جاتا ہے [1]

مارکس کے آخری ایام میں تہذیب جدید کے فکری بحران میں ایک اور اضافہ Freud (۱۸۵۶-۱۹۳۹) کی وجہ سے ہوا۔ اُس نے اِنسانی تعلقات کا تجزیہ — "Psycho-analysis" کی بنا پر کیا۔ اور اس نے کہا کہ انسان کی گہری باطنی حقیقت، صرف شہوانی (ID) طاقت نہیں بلکہ صرف جنسی طاقت ہے اور صرف جنسیت ہے۔ اور کوئی اِنسانی یا حیوانی طاقت نہیں۔ وہ یہاں تک کہتا ہے۔ کہ "پوری زندگی جنس سے بھری ہے اور جنس کا ظہور بلوغ کے وقت نہیں ہوتا جیسا کہ جاہل سمجھتے ہیں۔ بلکہ جنس تو پیدائش کے وقت بھی موجود ہوتی ہے اور جب انسان پیدا ہوتا ہے تو اس کے چھوٹے سے وجود میں خالص جنس ہوتی ہے۔" وہ اس طرح بھی کہتا ہے کہ "بچے کا دُودھ پینا، انگوٹھا چوسنا، عضلات کو حرکت دینا، بول و براز

---

[1] پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے زمانے میں اٹلی میں حب الوطن کی خاطر اور اشتراکیت کے خلاف Fascism کی تحریک شروع ہوئی تھی اور Benito-Mussolini (م ۱۹۴۵ء) میں تحریک کا قائد بن گیا تھا۔ دوسرے ملکوں میں یہ تحریک Black Shirt association

کرنا اور ماں سے لپٹنا وغیرہ سب جنسی اعمال ہیں۔" فرائڈ کا فراڈ یہاں تک ہے کہ" بچّہ اپنی ماں سے جنسی عشق کرتا ہے۔" اور بچّی اپنے باپ سے جنسی عشق کرتی ہے۔ مگر اس عشق کا اخفا..... (Supression) کرنا پڑتا ہے۔" غرض کہ اس نظریے والوں کے نزدیک دین اور اخلاق دونوں بے قیمت ہیں۔ اور صرف جنسیت ہر جگہ کارفرما ہے۔[1]

پھر فرائڈ کے بچپن میں Darwin نے فکری بحران میں ایک ہیجان پیدا کر دیا۔ یعنی اس نے حیوان کو انسان کی اصل کہا اور اس کے لیے دلائل قائم کیے۔ اُس نے ۱۸۵۹ء میں "اصل الانواع" کتاب لکھی اور ۱۸۷۱ء میں "اصل انسان" شائع کر کے انسانی فضیلت اور اس کی اصلیت کو ملیا میٹ کر دیا۔ گویا اُس نے وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ ...... (بنی اسرائیل ۷۰) کی نفی کی اس طرح تہذیبِ جدید کا انسان گومگو کی حالت میں مبتلا ہو گیا۔ اور تغیّر و ارتقا والا نظریہ پوری طرح دین کا حریف بن گیا۔ پھر یورپ کے صنعتی انقلاب اور مشینوں کے دھنوئیں نے انسان کی ذہنی اور فکری صلاحیتوں میں مزید ظلمت پیدا کر دی۔

ہم عرض کر چکے ہیں کہ کارل مارکس نے مادّیت پر اپنے کام کی بنیاد رکھی تھی۔ اس لئے روٹی اور مادّہ اس کام کا نقطۂ آغاز ہے اس مادّیت کو پھیلانے کے لیے نعروں سے کام لیا جاتا ہے۔ جو روٹی اور مساوات کی تبلیغ کے لیے ہوتے ہیں۔ اور مزدوروں اور غریبوں

---

[1] اس کی تفصیل فرائڈ کی کتاب "The ego and the ID" میں ملتی ہے۔

کو ہم نوا بنایا جاتا ہے۔ پھر مختلف طبقات کو آپس میں لڑانے کے لیے انتشار، توڑ پھوڑ، قتل و غارت، خون خرابہ، خفیہ سازشیں اور اخلاق سوز حرکتیں سب جائز سمجھی جاتی ہیں اور خدا کے منکر ہونے کی وجہ سے اس نظریے کے لوگ ہر ظلم کو مساوات اور سوویت کے نام پر ضروری سمجھتے ہیں۔ ہنگامے کرانا، اسٹرائک کرنا، کام نہ کرنا، کارخانوں کے مالکوں کے خلاف سازشیں کرنا بھی اُن کے مسلک کی ضروریات میں شامل ہیں۔ علامہ اقبال نے مغربی اقتدار پرستی کی عیاری کا ذکر اس طرح کیا تھا کہ ؎

متاعِ غیر پہ ہوتی ہے جب نظر اس کی
تو ہیں ہر اول لشکر کلیسیا کے سفیر

لیکن اس تحریک والوں کی نظر جب متاعِ غیر پہ ہوتی ہے تو لوٹ مار، خون خرابہ، قتل و غارت، اُن کے حربے ہوتے ہیں اور اس طرح امن پسند عوام کو ان کا غلام بننے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اُن کے یہاں دولت کی مساویانہ تقسیم (۲) شخصی ملکیت کا استیصال، صرف دو مقصدوں کا اعلان ہوتا ہے۔ لیکن پھر عملی زندگی میں ایسے افراد اور ان کی جماعت پر جو کچھ گزرتی ہے، وہ ان کے قریب کے دیکھنے والوں کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ شخصی ملکیت مرکزی ملکیت میں ضم ہو جاتی ہے۔ اور مرکز کے قانون کے تحت، ہر فرد مشینی طرز کی زندگی گذارتا ہے۔ وہ روٹی کھا لیتا ہے۔ حیوانی ضرورتیں پوری کر لیتا ہے۔ لیکن وہ نہیں جانتا کہ ماں باپ کی شفقت اور اولاد یا کنبے والوں کی محبت کیا ہے وہ "مرکزی طاقت" کا مملوک (غلام) ہے۔ جو اپنی مرضی سے کچھ

نہیں کر سکتا۔ اور جس کی خودی مرچکی ہوتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق سورۃ النحل (۷۵) میں ارشاد ہے۔

ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْکًا لَّا یَقْدِرُ عَلٰی شَیْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰہُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَھُوَ یُنْفِقُ مِنْہُ سِرًّا وَّجَھْرًا ؕ ھَلْ یَسْتَوٗنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ؕ بَلْ اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ؕ

اللہ ایک مثال بیان کرتا ہے کہ غلام ہے جو دوسرے کے بس میں (ملکیت میں) ہے۔ کسی چیز پر اس کا بس نہیں چلتا اور ایک وہ شخص ہے جسے ہم نے اپنی طرف سے اچھی روزی عطا کی ہے اور وہ اس میں سے چھپا کر اور ظاہر (جیسا بھی موقع ہو) خرچ کرتا ہے۔ کیا یہ سب برابر ہیں؟ سب حمد اللہ ہی کے لئے ہے۔ بلکہ (یہ وہ بات ہے جسے) اُن میں سے اکثر نہیں جانتے۔

مزدک[1] کے چیلوں کی طرح اشتراکیت والوں نے مال اور زن کی مساوات کا نعرہ لگا کر لوگوں کے جائز اختیارات چھین کر اُن کو غلام بلکہ غلام سے بدتر زندگی پر مجبور کر دیا ہے۔ وہاں خانگی زندگی صرف کھانے پینے اور ہوس رانی تک محدود ہے کوئی کسی کا ہمراز و ہم نوا نہیں۔ جہاں ماں، باپ بیٹیا اور شوہر بیوی بھی ایک دوسرے پر شک کرے اور دُوسرے کی چغلی کھائے

---

[1] مزدک نیشاپور کا ایک شخص تھا۔ جو نوشیرواں کے والد کے زمانے کا تھا مال اور عورتوں کو چھین لینے کی تعلیم دیتا تھا۔ اور وہ اُسے مساوات کہتا تھا۔ نوجوانوں نے اس تعلیم میں بڑی لذت پائی۔ اور اس کی جماعت میں شریک ہو گئے۔ پھر نوشیرواں نے اس کو اور اس کے اسّی ہزار تابعین کو قتل کرا دیا۔ اسی لفظ مزدک سے مزد اور مزدُور لفظ بنے ہیں۔

وراثت کا حق نہ ہو۔ حقوق العباد اور باہمی ادائے حقوق کا کوئی جذبہ نہ ہو تو ایسے موقع پر غالب کے وہ اشعار یاد آتے ہیں جو انہوں نے انتہائی مایوسی کے عالم میں کہے تھے۔ یعنی

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

۱۹۱۷ء میں روس نے اشتراکی حکومت قائم کی جو حقیقت میں اُس پارٹی کی ڈکٹیٹر شپ تھی۔ امریکہ کے سابق صدر رچرڈ نکسن نے اپنی کتاب The Realwar میں عالمی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان میں سے چند اقتباسات کا پیش کرنا بے محل نہ ہوگا۔ وہ فرماتے ہیں کہ

" روس جس ملک پر قبضہ کرنا چاہتا ہے وہاں فاشزم سامراج کے خلاف نجات دہندہ بن کر اقتدار پر قبضہ کرتا ہے"

" ۱۹۳۰ء میں سوویت یونین میں جبریہ کھیتی کا نفاذ انسانی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے جو ہمارے وقت میں کمپوچیا کی نسل کشی کے لیے نمونہ بنا۔ خاندان منتشر کر دیے گئے۔ ایک خنزیر یا گائے کے بدلے کسانوں کو ذبح کر ڈالا گیا۔ لاکھوں کے اثاثے چھین لیے گئے اور انھیں مویشیوں کی طرح بھر کر سائبیریا میں مرنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ بچے اپنے ماں باپ سے بچھڑ کر اور یتیم ہو کر مارے مارے پھرتے رہے۔ لیکن یورپ کے لیڈر حضرات اپنی دانشوری کا لبادہ اوڑھ کر

تصوراتی رنگینیوں میں اس قدر محو ہو گئے۔ کہ انھیں یہ بہتا ہوا خون بھی بہت بھلا معلوم ہوا......" (یہاں برنارڈشا، جان ریڈ، جولین ہکسلے وغیرہ کی طرف اشارہ ہے)

" اسٹالن کے مرنے کے بعد اور اصلاحی معاشرے کی حیثیت سے سوویت یونین کی ساکھ اُکھڑ جانے کے بعد یورپ اور امریکہ کے وہ لوگ جو 'دُور کے ڈھول سہانے' پر یقین رکھتے ہیں۔ اب ماوزے تنگ اور ہوچی منہ کے کمیونزم کو اپنا معیار تصوّر جاننے لگے ہیں۔ یہ لوگ دوسرے ملکوں کے سیاسی کردار اور کامیابیوں کو اپنے تصوّر کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔ اور زمانے کے اتار چڑھاؤ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔"

"جس طبقے نے پہلی اور دوسری عالمی جنگ میں مضبوط لیڈر شپ دی تھی۔ وہی تیسری عالمی جنگ کے ویت نام محاذ پر ناکام رہی۔ بڑے صنعت کاروں کی قیادت کبھی امریکی قوّت کی بنیاد تصوّر کی جاتی تھی۔ اور وہ پوری طرح آزاد سمجھی جاتی تھی۔ لیکن اب چند قابلِ تعریف لوگوں کے علاوہ ان میں سے باقی لوگ بزدل ہو گئے ہیں۔ وہ افسر شاہی کو ناراض کرنے کی ہمت نہیں رکھتے اور نہ صارفین کے رہنماؤں کو ناراض کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ بڑے بڑے کارپوریشن خود بڑے بڑے بیوروکریٹ بن گئے ہیں۔"

یہ خیالات رچرڈ نکسن کے ہیں اور ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑا سیاست دان بھی فکری بحران میں مبتلا ہے۔ اور وہ صرف اپنے نظریے کے مطابق عالمی حقائق کا تجزیہ کرتا ہے اور اس طرح ایک "آفاقی" انسان گومگو میں پڑ کر سخت پریشان ہوتا ہوگا کیونکہ وہ فیصلہ نہیں کرسکتا کہ جاگیردارانہ نظام اچھا تھا یا سرمایہ دارانہ

نظام بہتر ہے۔ کمیونزم صحیح ہے یا فاشزم مناسب ہے۔ ڈارون صحیح کہتا ہے یا فرائڈ کی بات قابل اعتنا ہے۔ بہرحال یہ سب کچھ دین اور خدا سے واسطہ نہ ہونے یا بہت کم واسطہ ہونے کی وجہ سے ہے دین کو چھٹی دے دینے سے مادیت نے وہ گل کھلائے ہیں کہ الامان والحفیظ۔ ماں باپ، بیٹا بیٹی، بھائی بہن سب کے رشتے بہت کچھ تبدیل ہو چکے ہیں۔ تہذیب جدید والوں کی دنیا میں بوڑھے ماں باپ کو حکومت کی طرف سے جائے پناہ مل جاتی ہے جہاں ان کی اولاد سال چھ مہینے میں ایک آدھ مرتبہ سلام کرنے یا ہار پہنانے آجاتی ہے۔ اور ماں باپ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دیتے ہیں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جوان باپ گھر میں تنہا ہے اور اس کی بیوی اور نوجوان بیٹی رات بھر غائب ہے اور کبھی ماں گھر میں اکیلی ہے اور اس کا شوہر اور بیٹا رات بھر رنگ رلیوں میں مصروف دوسری جگہ پڑا ہوا ہے۔ ایسی صورت میں خواب آور گولیوں کی ضرورت پڑتی ہے کہ کسی طرح تنہا شخص کو نیند تو آجائے۔ اور ان گولیوں کو خریدنے کے لیے دکانوں کے آگے قطار لگی ہوئی نظر آتی ہے۔ پھر جوان بیٹے اور بیٹی کو قانون نے ایسی آزادی دے دی کہ ماں باپ کو کوئی حق نہیں کہ وہ ان لوگوں سے رات بھر غائب رہنے کا سبب بھی پوچھ سکیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بالخصوص لڑکیاں اپنا مستقبل بنانے کے لیے اکثر ماں باپ کے گھر سے دُور ہو جاتی ہیں۔ بلکہ بعض کی تو اُن کے مرنے کے بعد ہی اطلاع آتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر برائی کو قانونی تحفظ حاصل ہے۔ عریانی، بے حیائی، شراب خوری، ہر طرح کی بدکاری، جوا، سٹہ وغیرہ کونسی برائی ہے جو اچھی نہ سمجھی جاتی ہو۔ لیکن اب تہذیب جدید کے گرفتار شدہ لیکن سنجیدہ لوگ

اپنے اس معاشرے سے مایوس ہو کر کہنے لگے ہیں کہ ہم ان برائیوں میں اس قدر پھنس چکے ہیں کہ ان سے نکلنا ہمارے لیئے مشکل ہو گیا ہے۔ چنانچہ اُن میں سے ہر شخص "سکون" کی تلاش میں ہے جیسے وہ اپنے ہاتھوں کھو چکا ہے۔ لیکن یہ سکون سوائے اللہ سے رشتہ جوڑنے کے اور کہیں حاصل نہیں ہو سکتا۔ سورۃ الرعد (۲۸) میں ارشاد ہے اِلَا بِذِکرِ اللّٰہِ تطمئنُ القلوب ہ (جان لو کہ اللہ ہی کی یاد سے دلوں کو سکون حاصل ہوتا ہے)

بہر حال، جو حقائق عرض کیئے گئے وہ دین سے دُوری اور فکری بُحران کے عواقب و نتائج ہیں۔ اُردو کے بعض شعراء اور مصنفین نے بھی اسی بحران کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ بعض نے تو اس لیے کہ لوگ اُن کو جدید تعلیم یافتہ "سمجھنے لگیں۔ بعض کو "جدیدیت" کا حظ حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے اور بعض "کرائے" کے ہیں۔ بلکہ آج کل کی اصطلاح میں وہ "بکاؤ مال" ہیں اور انھیں خود بھی معلوم نہیں کہ اِس غلامانہ فکر کی منزل کیا ہے۔ ہمارے ادب میں ایسی کورانہ تقلید کرنے والے لوگ کئی زاویوں سے دین پر حملہ کرتے ہیں۔ کچھ تو ایسے ہیں جو اپنے آقاؤں کی تقلید میں (اور سمجھتے ہوئے بھی) اسلام کو بھی عیسائیت کی طرح کمزور اور تاریک دور کی خرافات کہتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو دین کو ایک وقتی چیز کہہ کر پس پشت ڈالنا چاہتے ہیں کہ اس کی ضرورت کبھی تھی اور اب نہیں ہے کچھ ایسے بھی ہیں جو اسلام کا نام لیے بغیر، اسلام کی باتوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ تاکہ نوجوان طبقے کے دلوں میں دین کی وقعت نہ رہے وہ اپنے ادب میں نقلی زندگی کو ملک کی زندگی کہتے ہیں۔ وہ ہمارے ملک کی زندگی نہیں ہے۔ وہ اُن کے تخیل کی زندگی ہے۔ اُن کے

ادب کو" ادب برائے تہذیبِ جدید" تو کہہ سکتے ہیں " ادب برائے پاکستان" نہیں کہہ سکتے۔ اور اُسے اگر " ادب برائے عوام " کہتے ہیں تو میں بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے عوام اُن کی طرح بے غیرت نہیں ہیں۔ اور وہ آج بھی بڑے بڑے بال رکھنے اور رنگین کپڑے پہننے کے باوجود دین کی خاطر گولیاں کھانے میں پیش پیش ہیں۔

آئیے اب اسی تہذیبِ جدید کے مقلدین کے ادب کا ایک اجمالی جائزہ بھی لے لیں۔

سنہ ۱۹۳۵ء میں حقیقت نگاری کے نام پر اُردو میں عریانی اور بے حیائی کا آغاز ہوا۔ اور اس کا نام ترقی پسند ادب رکھا گیا۔ اس تحریک کی ابتدا سجاد ظہیر، احمد علی، اور ڈاکٹر رشید جہاں نے کی۔ اور انگارے کے نام سے افسانوں کا ایک مجموعہ شائع کیا جس میں دین اور اخلاق پر حملے کیے گئے اور اشتراکی نظریات کی تبلیغ کی گئی۔ پھر سنہ ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد پڑی اور اُس کے اراکین نے اُسی مقصد کے پیشِ نظر اور حقیقت نگاری کا لبادہ اوڑھ کر دین، اخلاق، تہذیب اور ان کی اقدار کو لغو قرار دیا۔ بلکہ محض جہالت اور اوہام پرستی کہا۔ مادّہ کو اصل کہا۔ روح اور خدا کا انکار کیا۔ اور اس نظریے کی اس طرح تاویل کی کہ مادّی ارتقا ہی میں احساس، شعور، عقل اور ضمیر کی تخلیق ہوتی ہے اور دین محض فریبِ تخیل ہے۔ اور استحصالی طبقوں کا آلۂ کار ہے ہر دَور کا معاشی نظام ہی اُس دَور کے سماجی نظام کو متعین کرتا ہے۔ اسی کے ساتھ Freud کے ساتھ نظریات بھی شامل ہو گئے اور اب نفسیاتی ماحول اور سماجی تربیت کا مرکز روٹی کے بجائے جنسیت قرار پایا ہے۔ فرائڈ کے نزدیک انسانیت

دوستی دراصل اُس تشنہ کام جنسی جذبے کے لیے اب اعلیٰ راستہ نکالنے کی کوشش ہے جو تسکین نہیں پاتا اور پاک عشق و محبت، محض فطری جنسی جذبے کو اخلاقی اور سماجی تصورات کے تحت کچل دینے والی بددیانتی اور خود فریبی کا عکس ہے۔ لہٰذا گناہ اور ثواب، نیکی اور بدی، پاکیزگی اور عفونت، عظمت اور پستی کا کوئی ایسا معیار قائم نہیں کیا جاسکتا جو ہر حالت کے لیے صحیح قرار دیا جا سکے"۔ اس نظریے نے ترقی پسند ادب میں داخل ہو کر بے حیائی اور گندگی کو عام کر دیا۔ اور ایسے افسانے اور نظمیں شروع ہوئیں جن میں قوم کے فوجی اور کارخانے کے مزدور کی جنسی آسائش کے لیے لڑکیوں کو خود پیش کرنا فخر و مباہات سمجھا گیا۔ پھر تو اس ادب نے غلیظ سے غلیظ باتیں عام کر دیں۔ لیکن اس جنسی انارکی کے خلاف اہلِ علم حضرات کا شدید ردِ عمل ہوا تو ترقی پسند مصنفین نے محض فریب دینے کے لیے سنہ ۱۹۴۹ء میں ایک قرارداد منظور کی۔ کہ ہم جنسی انارکی کے خلاف ہیں۔ لیکن باتیں کچھ ہوتی ہیں۔ اور عمل کچھ ہوتا ہے اور اس عمل میں کوئی فرق کبھی نہیں آیا۔

ترقی پسند ادب کو ایک "چودھری" کی ضرورت تھی۔ جوش اس منصب کے لیے بہت مناسب قرار دیے گئے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مجموعے "عرش اور فرش" میں جو سنہ ۱۹۳۰ء سے سنہ ۱۹۴۳ء تک کے کلام پر مشتمل ہے۔ یہ رباعی شروع ہی میں لکھی ہے۔

ممنوع شجر سے لطفِ پیہم لینے
عصیاں کی گھنی چھاؤں میں پھر دم لینے
آواز دو کا شمیر آ پہنچا جوش
اللہ سے انتقامِ آدم لینے

ظاہر ہے کہ جس کلام کی ابتدا، ایسی ہو وہ کلام کیسا ہو گا؟ کفر و الحاد اور فسق و فجور کے پھیلانے اور بے حیائی کو عام کرنے میں جو

کارنامے جوشؔ نے انجام دیے ہیں۔ وہ کسی کے نصیب میں نہیں۔
مارکس والی جماعت سے جو کچھ انہیں حاصل ہوا اس کے شکریے
میں فرماتے ہیں۔

السّلام اے مارکس اے دانائے راز — اے مریضِ انسانیت کے چارہ ساز

مارکس کو پھر حضرت امام حسین کا "ہمدم" بھی بنا دیا فرماتے ہیں۔

ہمدمِ شبیر و بدخواہِ یزید! — موسیٰ نو بہرِ فرعونِ جدید

اے عدوئے نوریانِ شعلہ خو — اے انیسِ خاکیانِ مرد رو

منکرِ دارائی عرشِ بریں — اولیں پیغمبرِ فرشِ بریں

پھر اشتراکیت کی "روح" میں کچھ زیادہ لذت محسوس ہوئی
تو خدا کو اپنے آپ سے چھوٹا قرار دے دیا۔ لکھتے ہیں۔

لیتا ہے جو انتقام، کھوٹا ہے خدا — جس میں سونا نہیں شامل، وہ گوٹا ہے خدا

شبیر حسن خاں نہیں لیتے بدلہ — شبیر حسن خاں سے بھی چھوٹا ہے خدا

چنانچہ ایسے "بڑے" آدمی کی کتاب "یادوں کی برات" بے
حیائی کا شاہکار ہے اور نوجوانوں کو بہت پسند ہے۔ لیکن آج کل
کسی مصلحت کی بنا پر جوشؔ نے سورۃ الرحمٰن کی بعض نعمتوں
کو منظم کیا ہے۔ پہلا بند یہ ہے:۔

اے فنا انجام انساں کب تجھے ہوش آئے گا
تیرگی میں ٹھوکریں آخر کہاں تک کھائے گا
اس تمرّد کی روش سے بھی کبھی شرمائے گا
کیا کرے گا سامنے سے جب حجاب اٹھ جائے گا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا[1]

---

[1] رسالہ افکار کراچی۔ فروری ۱۹۸۰ء

نوجوانوں کو بے حجاب بنانے میں دوسرے کامیاب شاعر اختر شیرانی (م ۱۹۴۸ء) ہیں۔ وہ عشق اور رومان کے شاعر ہیں۔ سلمیٰ، عذرا، ریحانہ وغیرہ ان کی شاعری کا موضوع ہیں۔ اور اُن سے اپنے عشق کا وہ برملا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن اس میں جوش کی طرح "جنسی وحشت" نہیں ہے۔ تاہم وہ ناجائز معاشقے پر مبنی ہے جو دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیتا ہے۔ وہ بھی جوش کی طرح "اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے" کے قائل ہیں۔ انہیں بہت دکھ پہنچتا ہے جب اُن کی کوئی تخیلاتی محبوبہ شادی کر لیتی ہے۔ فرماتے ہیں:-

ہوس آلودہ ہوئی پاک جوانی تیری
غیر کی رات ہے اب اور کہانی تیری

اس نظم کے اشعار ایک ترک افسانہ نگار سامی بک سے ماخوذ ہیں۔ جو کہتا ہے کہ "شادی ایک جائز گناہ کا نام ہے اور گناہ گناہ برابر ہیں....."[1]

لیکن جوش کی چودھراہٹ کے باوجود ترقی پسند شعرا میں فیض سب سے زیادہ ممتاز ہیں۔ انھیں اشتراکیت سے وفاداری کی بنا پر "لینن کا امن انعام" جب سے ملا ہے ان کو اور ان کے مدّاحوں کو ان کے عظیم ہونے کا شدید احساس ہو گیا ہے[2]۔ ایک مرتبہ حکومت

---

[1] ڈاکٹر یونس حسنی نے رسالہ اُردو کراچی (شمارہ ۴ ۱۹۷۲ء) صفحہ ۱۲-۱۳- میں اس کی تفصیل دی ہے

[2] فیض کے بعض مدّاحین انہیں امیر خسرو کے بعد آخری عظیم شاعر سمجھنے لگے ہیں۔

نے اُن پر پابندی عائد کر دی تھی۔ تو وہ چیخ اُٹھے تھے کہ :۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

لیکن انھیں شاید اپنے "محسن ملک" کی پابندی یاد نہیں رہی جہاں کوئی شخص اس حکومت کے خلاف زبان بھی نہیں ہلا سکتا اور جہاں ذرا سے شک پر گولی سے اڑا دیا جاتا ہے یا عمر قید یا جلا وطنی کی سزا دی جاتی ہے۔

فیض کے یہاں دراصل غزل کی روایات ہر جگہ غالب ہیں رومان ہو اور یا انقلاب سے متعلق نظم ہو۔ یہ روایات ہمیشہ موجود ہیں۔ ایک نظم "شورشِ زنجیر بسم اللہ" میں کہتے ہیں :۔

ستم کی داستاں کشتہ دلوں کا ماجرا کہیے
جو زیرِ لب نہ کہتے تھے وہ سب کچھ برملا کہیے
مُصر ہے محتسب رازِ شہیدانِ وفا کہیے

لگی ہے حرفِ ناگفتہ پہ اب تعزیر بسم اللہ!
سرِ مقتل چلو بے زحمتِ تقصیر بسم اللہ!
ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ

رومانی شاعری کے چند اشعار دیکھیے۔

دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں
تری آواز کے سائے ترے ہونٹوں کے سراب

دشتِ تنہائی میں دُوری کے خس و خاک تلے
کھل رہے ہیں ترے پہلو کے سمن اور گلاب
اُٹھ رہی ہے کہیں قربت سے تری سانس کی آنچ
اپنی خوشبو میں سلگتی ہوئی مدھم مدھم (یاد)

ترقی پسند شاعروں میں ن۔م راشد، میراجی، مجازؔ، جاں نثار اختر، جذبی، ساحر، فکر تونسوی، مخمور جالندھری، احمد فراز، سردار جعفری، وغیرہ نے بڑے جوہر دکھائے۔ ن۔م۔ راشد فکر و عمل دونوں میں پوری آزادی چاہتے تھے۔ عورت، جنس اور شراب میں سکون تلاش کرتے تھے۔ اور دین سے اس قدر بیزار تھے کہ وہ کافرانہ کِریا کرم کے لیے وصیت بھی کر گئے تھے ۱؎

میراجیؔ بھی فرائڈ کی اُمّت میں سے تھے۔ سلام مچھلی شہری، مختار صدّیقی، شریف کنجاہی وغیرہ سے بھی زیادہ انھوں نے جنسیت کے کیچڑ کو اچھالا۔ لیکن ایک سنجیدہ شخص نے میراجی کے متعلق نہایت غیر سنجیدہ بات اس طرح کہی ہے کہ:۔

"اپنے زمانے کے مخصوص آدمی کی تمام شکلیں دیکھنے اور پھر انھیں اپنے پورے آدمی کے معیار پر پرکھنے کی جیسی صلاحیت میراجی میں تھی۔ اُن کے زمانے میں کسی شاعر میں نہ تھی۔" ۲؎ خدا جانے یہ پورا آدمی کیا تھا۔ جب کہ میراجی کی شاعری میں انتہائی عریانی، فحاشی اور جنسی بے راہ روی ہی کارفرما ہے کہ یہاں ایسی شاعری کی مثالیں دینا بھی غیر مناسب ہے۔

۱؎ یعنی جلانے کے لیے

۲؎ سلیم احمد "نئی نظم اور پورا آدمی" صفحہ ۱۵

مجاز کے مجموعۂ آہنگ کے دیباچے میں فیض نے لکھا ہے کہ "میں سمجھتا ہوں کہ مجاز کی خواب سحر اور نوجوان خاتون سے خطاب اس دور کی سب سے مکمل اور کامیاب ترقی پسند نظموں میں سے ہیں" اور خود مجاز اپنی نظم خواب سحر کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ "اگرچہ ایک نہ ایک مذہب تاریخِ انسانی کے ہر دور میں انسان کی اصلاح کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن اس کی حیثیت سعی خام سے زیادہ نہیں تھی۔ ...... انسانی تاریخ کی اس طویل اندھیری رات میں آج پہلے پہل انسان نے خواب سحر (اشتراکیت) دیکھا ہے" معلوم نہیں مجاز کو اس خواب کی تعبیر اور اس اشتراکیت کی عملی تصویر بھی کبھی دیکھنی نصیب ہوئی یا انہوں نے محض فیشن کی خاطر اس خواب کو صحیح سمجھ لیا۔ بہر حال مجاز نے اپنے اسی خیال کو اس نظم "خواب سحر" میں پیش کیا ہے۔ نظم اس طرح شروع ہوتی ہے:۔

مہر صدیوں سے چمکتا ہی رہا افلاک پر
رات ہی طاری رہی انسان کے ادراک پر

اور ختم اس طرح ہوتی ہے:۔

ذہن انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں
زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں
کچھ نہیں تو کم سے کم خواب سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک اُدھر دیکھا تو ہے

لیکن خواب دیکھ لینا اور اس طرف کو جھانک لینا، انسانی زندگی کے لیے کافی نہیں۔ معاشی آزادی اور زبان و قلم یا فکر و عمل کی آزادی، اشتراکی ملکوں میں ہے یا نہیں، ان کو قریب سے دیکھنے والے ہی جان سکتے ہیں۔ جب کہ وہاں کا ہر شخص اس قدر سخت گرفت

میں قید ہے کہ وہ ذاتی آزادی کے لیے سوچ بھی نہیں سکتا۔
مجازؔ کی دوسری "مکمل" اور "کام یاب" نظم "نوجوان خاتون سے خطاب"[۱] کی گئی ہے۔ اس کے صرف دو[۲] شعر ملاحظہ ہوں۔

اگر خلوت میں تو نے سر اٹھایا بھی تو کیا حاصل
بھری محفل میں آ کر سر جھکا لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

"بھری محفل میں سر جھکا لیتا" اور آنچل سے پرچم بنا لینا ایسے نکتے ہیں جو مجازؔ یا فیضؔ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ دوسروں کی رسائی وہاں تک مشکل ہے۔ پھر یہ فیشن جب "روٹی" کے سہارے جینے لگا تو اس دور میں اس نے کیسے کیسے گل کھلائے ہیں۔ صرف ایک مثال عرض ہے:۔
موجودہ بنگلہ دیش کے رنگ پور ضلع سید پور ایک مقام ہے وہاں کا ایک کمیونسٹ لکھتا ہے:۔
اے میرے رب ماؤزے تنگ۔
ہم ماؤزے تنگ کی اُمّت آج اعلان کرتے ہیں۔ کہ اگر کسی وقت تم (مسلمانوں) نے ہم لوگوں کے خلاف قدم اُٹھایا کہ جس سے ہماری قوم اور ہمارے خدا ماؤزے تنگ کی بدنامی ہوئی تو ہم اُس قدم کو کاٹ دیں گے۔ اور ایک ایک گھر میں گھس کر تمہاری ماؤں، بہنوں

۱؎ جاں نثار اختر بھی "نوجوان عورت" سے خطاب کرتے ہیں اور اسے چلمن، برقع، حجاب وغیرہ سے آزاد کرنا چاہتے ہیں۔ کہ ؎

اب تو محمل سے نکلنا ہے تجھے — رنگِ مقتل کو بدلنا ہے تجھے
وقت کی رو میں مچلنا ہے تجھے — تو بھی اب جاگ زمانہ جاگا

اور بیٹیوں کی بے حرمتی کریں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؛ ؏۱

یہ کمیونسٹوں کا عام مزاج ہے ۔ اور ان کے غلام انھی کی روٹی پر جیتے ہیں ۔ لیکن ہمارے ایک لیڈر نے بھی ۲۷ اپریل ۱۹۶۹ء کو اپنے کارکنوں سے لاہور میں فرمایا تھا ۔ کہ :-

" ہمیں پاکستان میں ایک مدت تک اسلام کا نقاب اوڑھ کر سوشلزم کے واسطے زمین ہموار کرنی ہوگی " ؏۲

گویا ہمارے بعض لیڈروں کے عزائم بھی " سرخ " تھے ۔ تو پھر ہمارا ادب کیوں نہ سرخ ہوگا ۔ چنانچہ اردو ناولوں اور افسانوں میں سے اکثر اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے ۔ بعض خالص اصلاحی بھی تھے ۔ اور کسی مقصدیت کے لیے تھے ۔ ایم اسلم اور رئیس احمد جعفری نے اخلاقی اور اصلاحی مقاصد کے لیے ناول لکھے ۔ لیکن عام دلچسپی کی خاطر انھیں عشق و عاشقی میں ملوث کر دیا ۔ اے آر خاتون کے ناول عموماً رومانی ہوتے ہیں ۔ اور وہ محض تفریح کے لیے لکھتی ہیں لیکن ان کا ناول " زیور " (دو حصے) بہت قابل قدر ہے ۔ اس میں مسلمان خواتین کی اصلاح کو پیش نظر رکھا گیا ہے ۔ لیکن ان کے بعض ناول (شمع ، تصویر ، ہالہ وغیرہ) میں معاشقوں کو بہت معصوم بنا کر پیش کیا ہے ۔ تاہم ان کے یہاں کسی طرح عریانی اور بے حیائی نہیں ہے ۔ شوکت تھانوی نے سراسر تفریحی ناول لکھے ہیں اور انھیں ہنسی مذاق کا ذریعہ بنایا ہے ۔ لیکن ان کے ہم نام شوکت صدیقی جو ناول اور افسانہ دونوں لکھتے ہیں ۔ زیادہ تر انسان کے

؏۱ ایشیا ۔ ۱۴ ستمبر ۱۹۶۹ء صفحہ ۱۳

؏۲ چٹان ۔ ۹ جون ۱۹۶۹ء صفحہ ۲

تاریک پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہیں۔ اُنھیں خدا کی بستی" ناول پر آدم جی پرائز ملا ہے۔ اس میں پاکستانی معاشرے کی صرف برائیوں کا ذکر ہے۔ جہاں روشنی کا نام نہیں۔

عصمت چغتائی کا رشتہ ترقی پسند مصنّفین سے ہے۔ ان کے ناول" ٹیڑھی لکیر" میں ایک ایسی لڑکی کا ذکر ہے۔ جو بچپن میں والدین کی مناسب تربیت سے محروم رہی اور اس کی شخصیت بگڑ گئی۔ پھر وہ نفسیاتی بھول بھلیوں میں گرفتار ہو کر گمراہ کن بن جاتی ہے عصمت کے دوسرے ناول اور افسانے اسی ترقی پسندی کی تبلیغ میں ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے ناولوں کی ٹیکنیک بہت پسند کی جاتی ہے "آگ کا دریا" اُن کا مشہور ناول [1] ہے۔ جس میں ہندوستان کی ڈھائی ہزار سالہ تاریخ پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ گوتم بدھ سے کہانی کا آغاز ہوتا ہے اور اس زمانے کے علم و فن، تہذیب و تمدن اور معاش و معاشرت کا ذکر کرنے کے فوراً بعد مسلمانوں کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔ لیکن سلاطین دہلی کا کسی مصلحت کی بنا پر یکسر نظر انداز کرکے جونپور کے حسین شرقی سے مسلمانوں کی تاریخ شروع ہوتی ہے جس میں جوگیوں، گیانیوں اور برہمنوں کے اثرات بتائے گئے ہیں۔ ابو المنصور کمال الدین ایک مسلمانی کردار ہے جو ہندوؤں کا زیادہ قائل ہے۔ پھر انگریزوں کی آمد کا ذکر شروع ہو جاتا ہے اور اس کے بعد ہی لکھنؤ میں ہندو مسلمانوں کی باہمی محبت کے واقعات

---

[1] پروفیسر ہارون الرشید کی کتاب" اُردو ادب اور اسلام" حصّہ دوم صفحہ ۱۷۱ - ۱۸۱ - میں اس ناول پر تفصیل سے بحث کی ہے راقم الحروف نے ان کی کتاب کے دونوں حصّوں سے مکمل استفادہ کیا ہے۔

آجاتے ہیں۔ اور اسلام اور پاکستان کے خلاف خوب زہر اگلا گیا ہے اور ایک سیاح کی زبانی یہاں تک کہلا دیا ہے کہ "مشرق کے زوال کا سبب اسلام ہے۔" پھر ایک موقع پر یہ بھی کہہ دیا ہے کہ:۔

"ہر ایماندار اور ضمیر پرست انسان نیشنلسٹ ہوگا۔" گویا درپردہ ہندوستان کی حمایت اور پاکستان کی مخالفت کی گئی ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ پاکستان میں بیٹھ کر یہ ناول لکھا ہے اور یہیں اس کی بڑی قدر کی گئی۔ ڈاکٹر احسن فاروقی نے بھی کئی ناول لکھے لیکن وہ فکری بحران میں بہت مبتلا تھے۔ انہوں نے عجیب عجیب دعوے کیے تھے۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "شاید ہی اُردو کا کوئی ناول نگار مجھ سے زیادہ ناول کے فن سے کبھی واقف ہوا ہو۔"[1]

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "ایک کامیاب ناول لکھ جانا پیغمبری کے درجے پر پہنچنے سے کم نہیں۔"[2] پھر انہوں نے اپنے دل کی بات ایک جگہ اس طرح کہہ دی کہ جدید دور میں نفسیات سے واقفیت نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ اخلاقی معیار بالکل ڈھونگ ہیں اور افسانہ، ناول اسی بنا پر کہلایا کہ اس میں اخلاق کو چھوڑ کر نفسیات پر زور دیا گیا ہے۔[3]

---

[1] ادبی تخلیق اور ناول صفحہ ۵۲

[2] ایضاً صفحہ ۱۸۔

[3] ایضاً صفحہ ۱۴۳۔ اسی کتاب (صفحہ ۴۶) میں ڈاکٹر احسن فاروقی نے ایک اور پرلطف بات کہی ہے کہ اس ناول (شامِ اودھ) پر ہر قسم کی منشیانہ تنقید ہو چکی ہے مگر اس کے کوئی معنی نہیں میرے لیے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ عوام میں سے کوئی ایسا فرد نہ ملا جس نے اسے دلچسپ نہ کہا ہو۔" ڈاکٹر صاحب سے معلوم نہیں کتنے عوام نیاز حاصل کرنے آئے اور کس طرح اپنی دلچسپی ظاہر کی۔

لیکن ہم کہتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے نفسیات سے زیادہ نفسانیت پر زور دیا ہے۔ تاہم نسیم حجازی اور قفضلی جیسے چند ناول نگار ایسے ہیں۔ جنھوں نے ایسی نفسانیت کے بجائے انسانیت کو قائم رکھا ہے اور دین و اخلاق ہی کو اپنے فن کی اساس قرار دیا ہے۔

فکری بحران کے شکار ایسے ادیب اور افسانہ نگار تھے جو "ادب لطیف" کے نام سے فرائڈ کی یاد تازہ کر رہے تھے۔ لیکن ان کے ادب کی یہ "لطافت" ۱۹۳۵ء میں "کثافت" میں تبدیل ہو گئی۔ جب کہ احمد علی سجاد ظہیر اور ڈاکٹر رشید جہاں نے دین و اخلاق کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کر کے "انگارے" پھانکے اور ہر چیز کو مادّی حقیقت میں دیکھنے کی تبلیغ کی۔ دوسرے سال انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد پڑی اور ان مصنفین میں کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس، غلام عباس وغیرہ نے نمایاں کردار ادا کیا اور "حقیقت نگاری" کے جوش میں تمام روایات اور پرانی اقدار سے بغاوت کر کے دین" اخلاق" مروّت، تہذیب، شرافت وغیرہ کو لغویات اور اوہام قرار دیا اور دعویٰ کیا کہ یہ سب بورژوا طبقے کی ایجاد کردہ اقدار ہیں۔ بلکہ پرولتاریوں (مظلوم طبقے) کے خلاف "سازشیں" ہیں۔ ایسے "حقیقت نگاروں" میں پھر کسی نہ کسی صورت میں احمد ندیم قاسمی، عزیز احمد، مہندر ناتھ، عادل رشید، ابراہیم جلیس، ہاجرہ مستور، خدیجہ مستور، بلونت سنگھ، رضیہ سجاد ظہیر، شوکت صدیقی، جیسے اور لوگ بھی شامل ہو گئے اور جدیدیت کی لذت حاصل کرنے لگے۔

تاہم اللہ پاک کا بڑا احسان ہے کہ ہمارے ملک میں بے حیائی

کی تبلیغ اور دین سے دُوری پیدا کرنے کا رجحان کچھ برسوں سے کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ کوئی ادیب، شاعر یا افسانہ نگار کھلم کھلا دین کا استخفاف نہیں کرتا۔ البتہ یہ کام کسی حد تک ادب کے بجائے ذرائع ابلاغ نے اپنے ذمّے لے لیا ہے اور تہذیبِ جدید کے فکری بحران کو پروان چڑھانے میں ریڈیو، ٹی وی، فلمی رسالوں، فلمی اخباروں اور ڈائجسٹوں نے بڑا موثر کردار ادا کیا ہے۔ جن کے متعلق سورۃ المجادلہ کی آیت ۱۹ میں ارشاد ہوتا ہے کہ :۔

اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

(شیطان نے اُن پر قابو پا لیا ہے۔ پس اُس نے اُن کو اللہ کی یاد سے غافل کر دیا ہے۔ یہ شیطان کی جماعت ہو۔ یاد رکھو، شیطان کی جماعت ہی نقصان اُٹھانے والی ہے)۔

اِس وعید کے بعد اِن ذرائع ابلاغ والوں کا جو حشر ہونا ہے اُس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۔

کتابیات

اِس موضوع کے سلسلے میں یہ کتابیں، رسالے اور مقالے مفید ہو سکتے ہیں:۔

۱۔ آغوشِ شب (کیفی اعظمی) کتب پبلشرز۔ بمبئی۔

۲۔ آزادی کا ادب (جلد اول) مرتبہ گوپال متل (نظم و نثر)

۳۔ اُردو ادب کی آڑ میں (رشید احمد لاشاری) کراچی۔ جون ۱۹۶۵ء

۴۔ اُردو ادب اور اسلام (پروفیسر ہارون الرشید) لاہور۔ حصّہ اوّل نومبر ۱۹۶۸ء حصّہ دوم۔ فروری ۱۹۷۰ء۔

۵۔ اُردو ادب کے رجحانات پر ایک نظر (ڈاکٹر عبدالعلیم) آزاد کتاب گھر۔ دہلی۔

۶۔ انگارے (احمد علی، سجاد ظہیر، ڈاکٹر رشید جہاں) یونائیٹڈ انڈیا پریس۔ لکھنؤ ۱۹۳۵ء۔

۷۔ پرانے خدا (کرشن چندر) مکتبۂ اُردو۔ لاہور

۸۔ پرچم (سبطِ حسن) لکھنؤ ۱۹۲۹ء۔

۹۔ ترقی پسند ادب (عزیز احمد) ادارۂ اشاعتِ اُردو حیدرآباد دکن نیا ایڈیشن۔ دہلی ۱۹۷۹ء

۱۰۔ ترقی پسند ادب (سردار جعفری) انجمن ترقی اُردو ہند۔ علی گڑھ۔

۱۱۔ ترقی پسند تحریک (ڈاکٹر وحید قریشی) ۲۲۔ قسطیں ہفتہ وار "زندگی" لاہور میں شائع ہوئیں (۱۵ دسمبر ۱۹۶۹ء تا ۱۸ مئی ۱۹۷۰ء)

۱۲۔ تلخیاں (ساحر لدھیانوی) حالی پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی۔

۱۳۔ چراغِ راہ (ماہنامہ) کراچی (آزادی نمبر وغیرہ) خصوصاً
آگ کا دریا اور خدا کی بستی پر محمود فاروقی وغیرہ کے مفصل تبصرے
۱۴۔ خدا کی بستی (شوکت صدیقی) کراچی سے شائع ہوئی
ٹی وی پر ڈرامائی تشکیل کی گئی۔
۱۵۔ روشنائی (سجاد ظہیر) لاہور اور کراچی ۱۹۷۷ء
۱۶۔ شاہراہ۔ (ساحر لدھیانوی وغیرہ) دہلی ۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۷ء
۱۷۔ عظمتِ آدم۔ (ظہیر کاشمیری) نیا ادارہ لاہور۔
۱۸۔ عورت اور دیگر افسانے (ڈاکٹر رشید جہاں) ہاشمی بکڈپو
لاہور اور مکتبہ جامعہ ۱۹۷۹ء
۱۹۔ قومی جنگ (بمبئی) مدیر سجاد ظہیر ۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۳ء
۲۰۔ گفتگو (رسالہ) ترقی پسند ادب نمبر۔ بمبئی۔ مرتبہ سردار جعفری
جلد اول۔ مارچ ۱۹۸۰ء۔
۲۱۔ لندن کی ایک رات (سجاد ظہیر) نیا ادارہ لاہور
۲۲۔ ماورا (ن۔م۔راشد) نیا ادارہ۔ لاہور
۲۳۔ محاذ (رسالہ) بمبئی۔ مدیر۔ رفیق گوالیاری ۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۰ء
۲۴۔ من آنم (فراق گورکھپوری) ادارہ فروغ اردو۔ لاہور۔
۲۵۔ نظام (بمبئی) فردوس صہبائی ۱۹۴۶ء تا ۱۹۴۷ء
۲۶۔ نیا ادب (کشن پرشاد کول) انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۵۳ء
۲۷۔ نیا ادب۔ (ماہنامہ) لکھنؤ۔ مدیر سبط حسن ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۲ء
۲۸۔ نیا ادب (ماہنامہ) لکھنؤ مدیر سردار جعفری ۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۰ء
۲۹۔ نیا ادب کیا ہے؟ (ماہنامہ نیا ادب کا خاص نمبر) مرتبہ:
سبطِ حسن ۱۹۴۱ء۔
۳۰۔ نیا ادب میری نظر میں (مجموعۂ مضامین) مرتبہ آغا سرخوش قزلباش

ہندوستانی پبلشرز ۔ دہلی۔ ۱۹۴۴ء۔

۳۱۔ نیا دنیا کو سلام ۔ (طویل منظومات وغیرہ)۔ مرتبہ سردار جعفری کتب پبلشرز۔ بمبئی۔

۳۲۔ نیا زمانہ ۔ (بمبئی) مدیر سجاد ظہیر، ۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۵ء۔

۳۳۔ نئے ادبی رجحانات (ڈاکٹر اعجاز حسین) ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد (دکن)

۳۴۔ یادوں کی برات (جوش ملیح آبادی) کراچی ۱۹۷۰ء

۳۵۔ یہ کس کا خون ہے ؟ سردار جعفری ۔ کتاب گھر۔ حیدرآباد دکن۔

ان کے علاوہ :۔

(الف) جوش اور احمد فراز کی منظومات۔

(ب) اُردو ڈائجسٹ (لاہور) میں ایک مرتبہ الطاف حسین قریشی نے شیخ ایاز وغیرہ کی کتابوں اور تحریروں کا جائزہ لیا تھا شیخ ایاز کی ایک کتاب رائٹرز گلڈ نے شائع کی تھی وہ زیر بحث تھی۔

(ج) نقوش لاہور میں ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۵ء کے دوران اسلامی ادب کی مخالفت کی بحث شائع ہوئی تھی۔

(د) نقوش (لاہور) کے افسانہ نمبر ۱۹۵۶ء (دو جلد) میں ترقی پسند افسانوں کے خلاصے اور اقتباس شامل ہیں۔

(ھ) ڈاکٹر احسن فاروقی نے شاہد احمد دہلوی کے انتقال کے بعد اُن کے رسالے ساقی میں ایک افسانہ " چار درویش " شائع کیا جس میں خلفائے ثلاثہ پر تبرّا کیا تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے صدق جدید میں اس کی نشان دہی کی تو وہ نمبر ضائع کر دیا گیا

(و) مولوی عبدالحق نے چند ہم عصر میں نام دیو مالی کے سلسلے میں لکھا " حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی۔ خدا یہ نہیں پوچھے

گا کہ تو نے کتنی اور کس کی پوجا پاٹ یا عبادت کی؟ وہ کسی کی عبادت کا حساب
نہیں، وہ پوچھے گا تو یہ پوچھے گا کہ میں نے جو استعداد تجھ میں ودیعت کی تھی اُسے
کمال تک پہنچانے میں اور اُس سے کام لینے میں تو نے کیا کیا اور
خلق اللہ کو اس سے کیا فائدہ پہنچایا؟ اگر نیکی اور برائی کا
یہ معیار ہے تو نادم دیو نیک بھی تھا اور برا بھی۔

مصنّف کی دوسری کتابیں

نمبر	نام کتاب	نمبر	نام کتاب	نمبر	نام کتاب
۱	سید حسن غزنوی	۲۱	دیوان عظیم تتوی	۴۱	رسالۂ سلوک
۲	فارسی پر اردو کا اثر	۲۲	اثبات النبوہ	۴۲	جامع القواعد (حصۂ نحو)
۳	تاریخ بہرام شاہ غزنوی (انگریزی میں)	۲۳	رسالۂ تہلیلیہ	۴۳	مکتوبات امام ربانیؒ (تین دفتر)
۴	حالی کا ذہنی ارتقاء	۲۴	مکاشفات عینیہ	۴۴	لوایح خانقاہ مظہریہ (مکتوبات)
۵	علمی نقوش	۲۵	فضائل صحابہؓ	۴۵	مکتوبات معصومیہؒ (تین دفتر)
۶	فارسی کے قدیم شعراء	۲۶	حضرت مجدد الف ثانیؒ کا تحقیقی جائزہ	۴۶	اردو میں دینی ادب
۷	رسائل مشاہیر نقشبندیہؒ	۲۷	تاریخ اسلاف	۴۷	اقبال اور قرآن
۸	ملفوظات صوفیہ	۲۸	ثقافتی اردو	۴۸	معارف اقبال
۹	ارشاد رحیمیہ	۲۹	ضیاء القرات	۴۹	سبیل الرشاد
۱۰	ہدایت الطالبین	۳۰	انتخاب مکتوبات امام ربانیؒ	۵۰	ندائے سحر
۱۱	تحفۂ زواریہ	۳۱	سوانح امیر کلالؒ	۵۱	اردو میں قرآن و حدیث کے محاورات
۱۲	وسیلۃ القبول (دو حصے)	۳۲	سعید البیان	۵۲	سراج منیر
۱۳	ادبی جائزے	۳۳	مسائل اربعین	۵۳	مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشت کابل
۱۴	تحریر و تقریر	۳۴	گلشن وحدت	۵۴	ترجمۂ حضرات القدس
۱۵	متین برہانپوری کے مرثیے	۳۵	مکتوبات سیفیہؒ	۵۵	خزینۃ المعارف حضرت خواجہ عبیداللہ سمرقندی
۱۶	سندھی اردو لغت	۳۶	مجمع البحرین	۵۶	ترجمۂ زبدۃ المقامات
۱۷	اردو سندھی لغت	۳۷	قرآنی عربی	۵۷	مطالب القرآن
۱۸	تفسیر مولانا عبیداللہ سندھی (انگریزی میں)	۳۸	برصغیر میں فارسی ادب (انگریزی میں)	۵۸	
۱۹	ترجمۂ قرآن پاک از مخدوم نوح (پہلا پارہ)	۳۹	تحقیقی جائزے	۵۹	
۲۰	دیوان روشن	۴۰	وصال احمدیؒ	۶۰	

(الائیڈ پرنٹنگ پریس حیدرآباد)